بچوں کو

گمراہی و بے راہ روی سے

کیسے محفوظ رکھیں؟!

بسم الله الرحمن الرحيم

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وعَجِّلْ فَرَجَهُم

فہرست عناوین

دیباچہ

یہ زمانہ رفتار کا زمانہ ہے، مگر سمت کا نہیں۔ معلومات کی فراوانی ہے، مگر حکمت کی قلت۔ ذرائع کی بہتات ہے، مگر مقاصد کی دھندلاہٹ۔ ایسے دور میں جب بچے اسکرینوں کی روشنی میں پل رہے ہوں، نوجوان نظریاتی کشمکش کے طوفانوں میں گھرے ہوں، اور تعلیم، میڈیا اور معاشرتی فضا ان کے شعور کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہوں، تو سب سے بڑا سوال یہی بنتا ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کو گمراہی، بے راہ روی اور فکری غلامی سے کیسے محفوظ رکھیں؟ زیرِ نظر کتاب اسی اضطراب کا جواب ہے۔ یہ محض چند تحریروں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک فکری لائحۂ عمل ہے۔ اس کے مقالات والدین، مربیوں اور اساتذہ کے لیے تحریر کیے گئے ہیں تاکہ وہ اپنے گھروں، تعلیمی اداروں اور سماجی حلقوں میں ایسی فضا قائم کر سکیں جو بچوں اور نوجوانوں کی خودی، ایمان اور شعور کی حفاظت کر سکے۔ یہ مضامین کتاب ''ہم فکری سے ہم راہی تک'' سے ماخوذ ہیں، لیکن یہاں انہیں ایک نئی ترتیب اور مقصد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے تاکہ تربیت کے میدان میں براہِ راست رہنمائی فراہم کی جا سکے۔

آج کا سب سے بڑا فتنہ یہ نہیں کہ بچے دین کے خلاف سوال کرتے ہیں؛ اصل فتنہ یہ ہے کہ وہ سوال کرنا چھوڑ دیں اور خاموشی سے ہر نظریہ قبول کر لیں۔ اصل خطرہ یہ نہیں کہ نوجوان آزادی چاہتے ہیں؛ خطرہ یہ ہے کہ وہ آزادی کے نام پر اپنی شناخت کھو بیٹھیں۔ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ دنیا بدل رہی ہے؛ مسئلہ یہ ہے کہ تبدیلی کی رفتار میں ان کی روحانی بنیادیں کمزور نہ پڑ جائیں۔

اس کتاب میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تربیت محض نصیحت سے نہیں ہوتی بلکہ ماحول سے ہوتی ہے۔ بچوں کو گمراہی سے بچانے کا مطلب انہیں دنیا سے کاٹ دینا نہیں بلکہ انہیں اتنا مضبوط بنانا ہے کہ وہ دنیا کے اندر رہ کر بھی اپنی شناخت برقرار رکھ سکیں۔ انہیں خوف سے نہیں بلکہ شعور سے محفوظ کرنا ہے۔ انہیں جبر سے نہیں بلکہ محبت، مکالمے اور دلیل سے سنوارنا ہے۔

جدید تعلیمی نظام، میڈیا کی یلغار، ورچوئل ریئلٹی کی کشش، احساسِ کمتری اور محرومی کی نفسیات، شادی اور خاندان کی تاخیر سے پیدا ہونے والے مسائل، اور نوجوانوں کی دینی رہنمائی کے فطری طریقے—یہ سب وہ موضوعات ہیں جو اس کتاب میں تفصیل سے زیرِ بحث آئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ والدین اور اساتذہ محض ردِ عمل کا شکار نہ رہیں بلکہ پیشگی حکمتِ عملی اختیار کریں۔ وہ اپنے

بچوں کو صرف امتحان پاس کرنے والا نہ بنائیں بلکہ امتحانِ حیات میں کامیاب ہونے والا بنائیں۔

یہ کتاب یاد دلاتی ہے کہ بچے ہماری ملکیت نہیں، امانت ہیں۔ ان کی روحیں نازک ہیں، ان کے سوال گہرے ہیں، اور ان کے اندر ایک عظیم مستقبل کی صلاحیت پوشیدہ ہے۔ اگر ہم نے انہیں صرف دنیا کی دوڑ کے لیے تیار کیا اور آخرت کی ذمہ داریوں سے غافل رکھا، تو ہم نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اور اگر ہم نے انہیں دنیا سے کاٹ کر محض روایتی مذہبیت میں محدود کر دیا، تو بھی ہم نے ان کی فطری استعداد کو سلب کر دیا۔

اس لیے ضرورت ایک متوازن، باشعور اور حکیمانہ تربیت کی ہے—ایسی تربیت جو ایمان کو عقل سے جوڑے، عبادت کو مقصد سے جوڑے، اور شناخت کو عمل سے جوڑے۔ ایسی تربیت جو "ہم فکری" کو "ہم راہی" میں بدل دے؛ یعنی صرف نظریاتی ہم آہنگی نہ رہے بلکہ عملی ہم سفری میں ڈھل جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کاوش والدین، مربیوں اور اساتذہ کے لیے چراغِ راہ بنے، اور ہماری نئی نسل کو ایسے شعور، ایمان اور استقامت سے آراستہ

کرے کہ وہ فتنوں کے اس دور میں بھی حق کا راستہ پہچان سکے اور اس پر ثابت قدم رہ سکے۔

وماتوفیقی الا باللہ۔

استعماری تعلیم کے اثرات سے بچوں کو کیسے محفوظ رکھیں

پاکستان جیسے ملک میں جہاں تعلیمی نظام استعماری طاقتوں کے زیر اثر ہے اور نصاب میں استعماری نظریات، مغربی افکار اور جدید غلامی کے اصول شامل کیے گئے ہیں، وہاں والدین کے لیے یہ چیلنج اور بھی بڑا ہو جاتا ہے کہ وہ بچوں کو رسمی تعلیم بھی دلوائیں اور انہیں ان نظریاتی زنجیروں سے بھی بچائیں جو ان کی فکری آزادی کو محدود کر سکتی ہیں۔ کیونکہ تعلیم کا حصول ایک سماجی اور معاشی ضرورت ہے، اور والدین بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے انہیں اسکول، کالج اور یونیورسٹی بھیجنے پر مجبور ہیں، اس لیے محض تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کوئی مؤثر حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بجائے، والدین کو ایک متوازی حکمت عملی اپنانی ہو گی جو بچوں کو تعلیمی نظام کے استعماری اثرات سے محفوظ رکھے اور ساتھ ہی ان کی فکری، روحانی اور تہذیبی بنیادوں کو مضبوط کرے۔

سب سے پہلا قدم والدین کی اپنی فکری اور نظریاتی بیداری ہے۔ جب تک والدین خود یہ شعور حاصل نہ کریں کہ تعلیمی نظام کے ذریعے کن تصورات کو

مسلط کیا جا رہا ہے، وہ اپنے بچوں کی صحیح فکری رہنمائی نہیں کر سکتے۔ انہیں نصاب میں موجود استعماری اثرات، سیکولر بیانیے، اور عقیدے و ثقافت کے خلاف ہونے والی علمی یلغار کو سمجھنا ہوگا تاکہ وہ بچوں کو ان کے متبادل نظریات مہیا کر سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ والدین خود اسلامی، تاریخی اور نظریاتی مطالعات کریں اور ایسے اسکالرز اور مفکرین کی تحریروں سے واقف ہوں جو مغربی استعمار کے خلاف فکری مزاحمت کر رہے ہیں۔

دوسرا اہم کام یہ ہے کہ بچوں کو باقاعدہ گھریلو فکری تربیت دی جائے۔ جب بچے اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں استعماری نظریات کا سامنا کرتے ہیں تو انہیں ان نظریات کے بارے میں پہلے سے ہی متبادل اسلامی اور فکری زاویہ فراہم کر دیا جائے۔ مثلاً، اگر تعلیمی نظام میں مغربی جمہوریت، لبرلزم اور سرمایہ داری کی برتری کو پڑھایا جا رہا ہے، تو والدین بچوں کو اسلامی نظام حکومت وسیاست، عدل پر مبنی معیشت اور خود مختار معاشرتی نظام کے بارے میں سکھائیں۔ گھر میں ایسی گفتگو عام ہو جو بچوں کو سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے کی صلاحیت دے اور وہ استعماری بیانیے کو بغیر سوچے سمجھے قبول نہ کریں۔

بچوں کو مطالعے کی ایسی عادت ڈالنی چاہیے جو انہیں یک طرفہ استعماری بیانیے سے نکال کر تاریخ اور حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے کے قابل بنائے۔

انہیں وہ کتابیں اور مضامین فراہم کیے جائیں جو استعماری طاقتوں کی سازشوں، اسلامی تہذیب کی برتری، اور مسلمانوں کے علمی و سائنسی کارناموں پر روشنی ڈالیں۔ ایسے اسکالرز جیسے سید قطب، علی شریعتی، محمد باقر الصدر، مرتضیٰ مطہری، اور اقبال جیسے مفکرین کی تحریریں بچوں کو نظریاتی طور پر مضبوط کر سکتی ہیں اور وہ استعماری ذہنیت کو پہچاننے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو ایسی محافل، اجتماعات اور فکری نشستوں میں لے کر جائیں جہاں انہیں حقیقی اسلامی، ثقافتی اور تہذیبی شعور مل سکے۔ یہ محافل انہیں اپنی شناخت کے بارے میں اعتماد دیں گی اور وہ مغربی افکار کے دباؤ میں آئے بغیر اپنی اصل روحانی و فکری جڑوں سے جُڑے رہیں گے۔ اگر ممکن ہو تو بچوں کو ایسے اساتذہ یا مصلحین کے زیر سایہ بھی تعلیم دلوانی چاہیے جو استعماری اثرات سے آزاد علمی ماحول فراہم کر سکیں۔

میڈیا کے ذریعے بچوں کی ذہن سازی بھی آج کے دور میں بہت اہم ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو استعماری بیانیے پر مبنی فلموں، ویب سیریز، اور مواد سے بچائیں اور ان کے لیے متبادل اسلامی اور تاریخی میڈیا فراہم کریں۔ بچوں کو اسلامی تاریخ پر مبنی ڈاکیومنٹریز، سیرت النبیؐ و سیرت معصومینؑ اور اسلامی زندگی کی روش پر بنے ہوئے معیاری مواد دکھایا جائے

تاکہ وہ اپنی تاریخ اور شناخت پر فخر محسوس کریں اور مغربی ثقافتی یلغار سے محفوظ رہ سکیں۔

بچوں میں یہ شعور پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ تعلیمی نظام میں دی گئی ہر چیز کو بغیر سوال کیے قبول نہ کریں، بلکہ ہر چیز پر تحقیق کریں، دلیل طلب کریں اور اسے اسلامی تناظر میں پرکھنے کی عادت ڈالیں۔ جب بچے یہ سیکھ لیں گے کہ مغربی نظریات اور تعلیمی نصاب کی ہر چیز کو عقلی اور دینی اصولوں کی روشنی میں دیکھنا ہے، تو وہ خود بخود اس نظریاتی یلغار سے محفوظ ہو جائیں گے۔

ایک اور اہم پہلو اسلامی عقائد اور عبادات کی عملی تربیت ہے۔ جب بچے گھر میں دین پر مضبوطی سے کاربند ہوں، نماز، دعا، اور دیگر عبادات کو ایک روحانی طاقت کے طور پر اپنائیں، تو وہ نظریاتی حملوں سے زیادہ مؤثر طریقے سے بچ سکتے ہیں۔ مغربی استعماری نظام کا سب سے بڑا ہتھیار یہی ہے کہ وہ بچوں کو ان کی روحانی بنیادوں سے کاٹ کر بے مقصد، مادہ پرست اور صرف دنیاوی کامیابی کے پیچھے بھاگنے والا بنا دے۔ جب بچے اپنے عقائد اور دینی اصولوں پر مضبوط ہوں گے تو وہ استعماری اثرات کو جڑ سے اکھاڑنے کے قابل ہو سکیں گے۔

بیدار اسلامی ممالک جیسے ایران اور عراق میں زیارات کے سفر نہ صرف روحانی بیداری کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ ایک عملی اسلامی معاشرے کا مشاہدہ کرنے کا بہترین موقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ زیارات کے دوران بچوں اور نوجوانوں کو ایک ایساماحول ملتاہے جہاں دین محض عبادات تک محدود نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کاایک مکمل نظام ہے۔

ایران میں مشہد میں امام رضاعلیہ السلام کے حرم اور قم میں حضرت معصومہ سلام اللہ علیہاکے روضے پر جانے سے زائرین کو اسلامی تعلیمات کے عملی نفاذ، دینی مراکز، حوزہ علمیہ، اور ایک نظریاتی طور پر مضبوط اسلامی حکومت کا مشاہدہ ہوتاہے۔ ایران میں اسلامی قوانین کے تحت زندگی کس طرح ترتیب دی گئی ہے، وہاں کاعدالتی اور تعلیمی نظام کس طرح مغربی اثرات سے آزاد ہو کر اپنی شناخت قائم رکھے ہوئے ہے، یہ سب کچھ ایک فکری بیداری کا باعث بنتاہے۔ قم میں علمی مراکز اور مشہد میں اسلامی ثقافت کے فروغ کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر بچوں میں یہ شعور پیداہوتاہے کہ ایک جدید اسلامی معاشرہ کس طرح مغربی تہذیب سے مرعوب ہوئے بغیر اپنی اصل شناخت برقرار رکھ سکتاہے۔

عراق میں نجف اور کربلا کی زیارات جہاں روحانی اعتبار سے ایمان کو تازہ کرتی ہیں، وہیں یہ مزاحمت اور استعماری سازشوں کے خلاف جدوجہد کی ایک زندہ مثال بھی پیش کرتی ہیں۔ نجف میں امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام کا حرم ایک مثالی اسلامی حکومت کے اصولوں کو سمجھنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ وہاں کے علمی مراکز، دینی قیادت کا کردار، اور معاشرتی انصاف کے اصول دیکھ کر بچوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں حکومت اور عوام کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔

کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے روضہ مبارک کی زیارت، عاشورہ کی تحریک کو تاریخ سے ہٹ کر ایک زندہ حقیقت کے طور پر سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ وہاں پر اربعین کے موقع پر لاکھوں زائرین کا اجتماع دیکھ کر یہ واضح ہوتا ہے کہ آج بھی اسلامی معاشرہ ظلم اور استکبار کے خلاف مزاحمت میں کس قدر فعال ہے۔ استعماری طاقتوں نے مسلمانوں کو منتشر کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی ہیں، ان کے مقابلے میں کربلا ایک ایسی مرکزیت فراہم کرتا ہے جو مسلمانوں کو جوڑنے اور مزاحمتی شعور بیدار کرنے میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔

ایران اور عراق کے سفر کے دوران یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہاں کے معاشرتی نظام میں دینی اقدار کو کیسے شامل کیا گیا ہے۔ خواتین کا حجاب، اسلامی تعلیمات کے مطابق عدالت کا قیام، دینی مراکز کی خود مختاری، اور مغربی ثقافتی یلغار کے خلاف مضبوط حکمت عملی یہ سب ایک مکمل اسلامی طرز زندگی کی جھلک پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوانوں کے لیے یہ ایک عملی تجربہ ہوتا ہے کہ وہ دیکھ سکیں کہ اسلامی طرز زندگی کا نفاذ کسی خیالی بات کے بجائے ایک حقیقت ہے، اور یہ مغربی ماڈلز کا محتاج نہیں ہے۔

اس لیے زیارات پر لے جانا نہ صرف روحانی تربیت کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ بچوں اور نوجوانوں کو عملی طور پر ایک اسلامی ریاست، اسلامی قوانین اور معاشرتی نظام کا تجربہ فراہم کرتا ہے۔ اس سفر کے بعد وہ استعماری اثرات کو بہتر انداز میں پہچاننے اور ان کے خلاف مزاحمت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی فکری، نظریاتی اور عملی تربیت میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہو سکتا ہے، اور انہیں مغربی فکری غلامی سے بچا کر ایک خود مختار اسلامی شناخت عطا کر سکتا ہے۔

یہ تمام اقدامات اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ بچے رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک مضبوط فکری، نظریاتی، اور تہذیبی بنیاد بھی حاصل کریں۔ والدین اگر

اس تربیتی نظام کو گھر میں نافذ کریں اور تعلیمی نصاب کے استعماری اثرات کے خلاف بچوں میں مزاحمت پیدا کریں، تو وہ مستقبل میں ایسے باشعور اور خود مختار مسلمان بن سکیں گے جو نہ صرف استعماری طاقتوں کے اثرات سے بچے رہیں گے بلکہ ان کے خلاف ایک فکری اور عملی جدوجہد کا حصہ بھی بن سکیں گے۔

نوجوانوں کی دینی رہنمائی: فطری طریقہ اور حکمت عملی

نوجوانی کا دور انسانی زندگی کا ایک نازک اور اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ اس عمر میں جذباتی، فکری، اور روحانی نشوونما ایک خاص رخ اختیار کر رہی ہوتی ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب بچے خود کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنی آزادی اور خودمختاری کے متلاشی ہوتے ہیں، اور اپنے نظریات کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ایسے میں اگر والدین اور اساتذہ دین کو زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کریں تو اکثر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور نوجوان دین سے دوری اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ دین کی طرف ان کی رہنمائی فطری طریقے سے کی جائے، انہیں سختی کے بجائے حکمت اور نرمی سے اس راہ پر چلایا جائے، اور سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ غیر مستقیم انداز میں ان کے دلوں میں دینی جذبہ پیدا کیا جائے۔

اگر دین کو بوجھ اور جبر کے طور پر پیش کیا جائے تو نوجوانوں کے لیے اسے قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن اگر انہیں یہ بتایا جائے کہ اسلام محض چند احکام و عبادات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک مکمل طرزِ زندگی ہے، تو ان کی دلچسپی

بڑھنے لگتی ہے۔ دین کی خوبصورتی کو ان کی فطرت، ان کی سوچ، اور ان کے سوالات کے مطابق پیش کرنا ضروری ہے۔ اگر انہیں آزادی دی جائے کہ وہ سوال کریں، اپنی الجھنوں کا اظہار کریں، اور پھر عقل و حکمت کے ساتھ ان کی رہنمائی کی جائے، تو وہ نہ صرف دین کو سمجھنے لگیں گے بلکہ اسے اپنی زندگی کا حصہ بھی بنالیں گے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ نوجوانوں کو دین کے دشمنوں اور ان کی سازشوں سے آگاہ کیا جائے۔ انہیں یہ بتایا جائے کہ استعماری قوتیں، میڈیا، اور مغربی نظریات کیوں اسلام کو کمزور کرنا چاہتے ہیں، کیوں مسلمانوں کی شناخت مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور کیسے ذہنی غلامی کے جال میں نوجوانوں کو پھنسایا جاتا ہے۔ جب انہیں یہ شعور دیا جائے گا کہ دین سے دوری دراصل دشمنوں کے منصوبے کا حصہ ہے، تو وہ خود بخود دین کی گہرائی میں جانا شروع کریں گے۔ نوجوانوں کے اندر ایک فطری باغیانہ رجحان ہوتا ہے، اور اگر انہیں یہ باور کرایا جائے کہ اصل بغاوت وہی ہے جو استعماری طاقتوں کے خلاف ہو، تو وہ دین کی طرف زیادہ سنجیدگی سے متوجہ ہوں گے۔

اس مقصد کے لیے سب سے پہلے ان سے دوستی کا رشتہ قائم کرنا ہوگا۔ والدین اگر صرف احکامات جاری کرنے والے بن کر رہیں گے تو نوجوان ان سے دور

ہو جائیں گے، لیکن اگر وہ اپنے بچوں کو یہ محسوس کرائیں کہ وہ ان کے جذبات، خیالات، اور احساسات کو سمجھتے ہیں، تو بچے خود بخود ان کی بات سننے لگیں گے۔ اگر نوجوانوں کو اعتماد دیا جائے، ان سے مشورہ کیا جائے، اور انہیں اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیا جائے تو وہ دین کی باتوں کو زیادہ توجہ سے سنیں گے اور ان پر غور کریں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ، دین کو محض عبادات کی فہرست کے طور پر نہ سکھایا جائے، بلکہ اس کے عملی فوائد اور اس کی حکمتیں بھی اجاگر کی جائیں۔ نماز کو محض ایک رسمی فریضہ کہنے کے بجائے اسے ذہنی سکون اور قوتِ ارادی کا ذریعہ بنا کر دکھایا جائے۔ روزے کو صرف بھوکا رہنے کا نام نہ دیا جائے، بلکہ اس کی جسمانی اور روحانی برکات پر روشنی ڈالی جائے۔ دینی تعلیمات کو عقل و منطق کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ نوجوان اسے کسی جبر کے بجائے اپنے فائدے کی چیز سمجھیں۔

نوجوانوں کے لیے ایک مقصد متعین کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر ان کے سامنے کوئی اعلیٰ ہدف نہیں ہوگا، تو وہ فضول تفریحات، عارضی لذتوں، اور وقت کے ضیاع میں مبتلا ہو جائیں گے۔ انہیں یہ باور کرایا جائے کہ وہ اس امت کے معمار ہیں، ان کے اندر وہ صلاحیتیں ہیں جو امتِ مسلمہ کو ترقی کی راہ پر ڈال

سکتی ہیں، اور انہیں اپنی زندگی کو ایک عظیم مشن کے لیے وقف کرنا ہے۔
انہیں امام علیؑ، امام حسینؑ، اور دیگر اسلامی شخصیات کی جدوجہد سے روشناس کرایا جائے، تاکہ وہ انہیں اپنے لیے رول ماڈل بنائیں۔

یہ تمام چیزیں تدریجی انداز میں، حکمت کے ساتھ اور نرمی سے سکھانے کی ضرورت ہے۔ سختی کرنے سے نوجوان بغاوت پر اتر آتے ہیں، لیکن اگر انہیں محبت دی جائے، ان کی سوچ کو اہمیت دی جائے، ان سے مکالمہ کیا جائے، اور ان کی فکری نشوونما کے لیے مواقع فراہم کیے جائیں، تو وہ خود بخود دین کے محافظ اور مبلغ بن جائیں گے۔ دین کوئی بیرونی چیز نہیں ہے جو ان پر تھوپی جائے، بلکہ یہ ان کی فطرت کا حصہ ہے۔ ضرورت صرف اس فطرت کو بیدار کرنے کی ہے، اور یہی سب سے مؤثر حکمتِ عملی ہے۔

والدین کے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ ہوتی ہے کہ ان کے بچے کس فکری اور عملی راستے پر جا رہے ہیں۔ آج کے دور میں، جہاں میڈیا، تعلیمی نظام، اور سماجی ماحول نوجوانوں کے ذہنوں کو ایک مخصوص سمت میں لے جانے کی کوشش کر رہا ہے، وہاں والدین کے لیے سب سے ضروری کام یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو شعوری طور پر ایک ایسا راستہ دکھائیں جو انہیں نہ صرف ایک باعزت، باوقار، اور باہدف زندگی کی طرف لے جائے، بلکہ انہیں اس عالمی

ابلیسی نظام کے شکنجے سے بھی آزاد کرے، جو انسان کی اصل شناخت، ایمان، اور غیرت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عالمی استکباری طاقتیں کیوں نوجوانوں کو بے مقصدیت، تفریحی جنون، اور فکری غلامی میں مبتلا کرنا چاہتی ہیں۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ نوجوان کبھی اپنے دین، اپنی ثقافت، اور اپنی ذمہ داریوں کو نہ سمجھیں۔ وہ کبھی بھی ظلم کے خلاف کھڑے نہ ہوں، وہ کبھی بھی یہ سوال نہ کریں کہ ہمیں کن راستوں پر چلایا جارہا ہے، اور وہ کبھی بھی اسلامی قیادت یعنی امامت و ولایت کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ والدین کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ان حقیقتوں سے آگاہ کریں اور انہیں بتائیں کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ محض اتفاق نہیں بلکہ ایک منصوبے کے تحت ہو رہا ہے۔

نوجوانوں کے لیے دین کو سختی اور جبر کے بجائے ایک پر کشش اور عملی نظام کے طور پر پیش کرنا ضروری ہے۔ اگر والدین صرف نصیحتیں کرتے رہیں اور دین کو صرف ایک عبادتی رسم کے طور پر پیش کریں، تو نوجوان اسے ایک روایتی چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے۔ لیکن اگر انہیں بتایا جائے کہ دین ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو ظلم کے خلاف کھڑے ہونے، باطل کا مقابلہ

کرنے، اور خود کو دنیا میں ایک مثالی انسان بنانے کا درس دیتا ہے، تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔

والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے گھروں میں ایسی فضا قائم کریں جہاں دینی گفتگو صرف روایتی انداز میں نہ ہو بلکہ ایک فکری اور عملی جہت رکھتی ہو۔ بچوں سے سوال کریں، ان کی رائے جانیں، انہیں تحقیق کی طرف مائل کریں۔ انہیں بتائیں کہ دنیا میں جو جنگیں ہو رہی ہیں، جو میڈیا پر پروپیگنڈے کیے جا رہے ہیں، جو نظریاتی حملے ہو رہے ہیں، وہ دراصل اسلام کو کمزور کرنے کے لیے ہیں۔ اگر نوجوان یہ شعور حاصل کرلیں کہ انہیں ایک مخصوص ایجنڈے کے تحت دین سے دور کیا جارہا ہے، تو وہ خود بخود بیدار ہو جائیں گے۔

نوجوانوں کو دین سے جوڑنے کے لیے انہیں دینی شخصیات کی مجاہدانہ زندگیوں سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ امام علیؑ، امام حسینؑ، اور دیگر معصومینؑ کی زندگیوں کو صرف تاریخی واقعات کے طور پر پیش کرنے کے بجائے، انہیں عملی نمونہ بنا کر دکھایا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ اگر یہ ہستیاں بھی خاموش رہتیں، اگر یہ بھی سازشوں کے سامنے جھک جاتیں، تو آج دین کا کوئی نام و نشان نہ ہوتا۔ جب نوجوان یہ محسوس کریں گے کہ وہ بھی اسی مشن کا حصہ بن

سکتے ہیں اور ان کے سامنے بھی ایک عظیم مقصد ہے، تو وہ اپنا راستہ خود متعین کریں گے۔

والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے ایک متبادل فکری اور عملی نظام قائم کریں۔ اگر والدین خود مغربی نظامِ تعلیم، میڈیا، اور ثقافت کو ہی زندگی کی کامیابی کا معیار سمجھیں گے، تو پھر وہ اپنے بچوں کو کیسے اس سے بچائیں گے؟ اس کے برعکس، اگر وہ اپنے گھروں میں دینی سوچ کو پروان چڑھائیں، اسلامی تاریخ اور تعلیمات پر بات کریں، اور نوجوانوں کو ایک ایسی فضا فراہم کریں جہاں وہ اپنے دین کو جدید دنیا کے مسائل کا حل سمجھ سکیں، تو وہ اس راستے کو خود اختیار کریں گے۔

نوجوانوں کو دین کی طرف مائل کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ انہیں میدانِ عمل دیا جائے۔ اگر وہ صرف سننے والے بن کر رہیں گے، تو وہ جلد یا بدیر اس راستے سے ہٹ جائیں گے، لیکن اگر انہیں کسی تحریک، کسی مشن، کسی عملی سرگرمی کا حصہ بنایا جائے، تو وہ دین کے عملی تقاضے کو سمجھنے لگیں گے۔ انہیں علمی، سماجی، اور فکری محاذوں پر کام کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں، تاکہ وہ محسوس کریں کہ وہ ایک بڑی تحریک کا حصہ ہیں۔

آخر میں، سب سے اہم چیز دعا اور والدین کا اپنا کردار ہے۔ اگر والدین خود اپنے عمل سے یہ ثابت کریں کہ وہ دین کو زندگی کا حقیقی نظام سمجھتے ہیں، تو ان کے بچے بھی اسی راہ پر چلیں گے۔ اگر وہ خود بھی اسی مغربی طرزِ زندگی اور دنیاوی مادی کامیابیوں کے پیچھے دوڑیں گے، تو ان کے بچوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ دین کے راستے کو اپنائیں، غیر منطقی ہو گا۔ والدین کے کردار، گفتار، اور طرزِ زندگی میں جو اخلاص ہو گا، وہی ان کے بچوں کے دلوں پر اثر ڈالے گا۔

یہی وہ راستہ ہے جو نوجوانوں کو عالمی استکباری نظام سے آزاد کر کے، انہیں ایک حقیقی دینی، فکری، اور عملی قیادت کی طرف لے جا سکتا ہے۔ اگر والدین یہ ذمہ داری سنجیدگی سے نبھائیں، تو وہ نہ صرف اپنی نسل کو محفوظ کر سکتے ہیں بلکہ وہ ایک ایسی نسل کی تربیت کر سکتے ہیں جو دین کے حقیقی محافظ اور مبلغ بنے گی۔

بچے آپ کے پاس خدا اور امام عصرؑ کی امانت ہیں

بچوں میں احساسِ کمتری، احساسِ محرومی اور احساسِ گناہ مختلف نفسیاتی، سماجی اور خاندانی عوامل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے احساسات کا آغاز عام طور پر ابتدائی عمر میں ہوتا ہے اور ماحول، پرورش کے انداز، والدین کی توقعات، تعلیمی دباؤ اور سماجی تقابل سے جُڑا ہوتا ہے۔ اگر بچہ مسلسل تنقید، تقابل، عدمِ توجّہ یا غیر متوازن محبت کا شکار ہو تو اس کے اندر یہ احساسات جڑ پکڑ لیتے ہیں۔

احساسِ کمتری اس وقت پیدا ہوتا ہے جب بچہ اپنی صلاحیتوں کو کمتر سمجھنے لگے، دوسروں سے خود کو کمتر محسوس کرے یا اس کی محنت کو سراہے بغیر اسے مسلسل دوسروں سے موازنہ کیا جائے۔ جب والدین یا اساتذہ بچوں سے ان کی استطاعت سے زیادہ توقعات وابستہ کرتے ہیں اور ناکامی پر حوصلہ دینے کے بجائے ملامت کرتے ہیں تو بچہ خود کو ناکام اور کمزور سمجھنے لگتا ہے۔ گھر میں اگر محبت، حوصلہ افزائی اور تسلیم کیے جانے کا ماحول نہ ہو، تو بچہ اپنی ذات کو کم تر محسوس کرتا ہے۔

احساسِ محرومی تب پیدا ہوتا ہے جب بچہ یہ سمجھنے لگے کہ اسے وہ چیزیں نہیں ملتیں جو دوسروں کو حاصل ہیں، چاہے وہ مادی اشیاء ہوں یا جذباتی توجہ۔ اگر

والدین کی محبت مشروط ہو، اگر ان کی توجہ صرف مخصوص حالات میں بچے کو ملے، یا اگر بچے کو بار بار یہ باور کرایا جائے کہ وہ دوسروں کی طرح خوش نصیب نہیں، تو اس کے اندر ایک مستقل احساسِ محرومی پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات مالی حالات، والدین کی مصروفیات، یا دوسرے بہن بھائیوں کی طرف زیادہ توجہ بھی کسی بچے کے اندر یہ احساس پیدا کر سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے برابر نہیں۔

احساسِ گناہ عام طور پر اس وقت جنم لیتا ہے جب بچے کو بار بار اس کی غلطیوں کے لیے موردِ الزام ٹھہرایا جائے، اسے احساس دلایا جائے کہ وہ اچھا نہیں یا وہ ہمیشہ کچھ غلط ہی کرتا ہے۔ اگر والدین یا اساتذہ ہر غلطی پر سخت ردعمل دیں اور غلطی کے اصلاحی پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف سزا اور شرمندگی کو اہمیت دیں، تو بچہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی مذہبی یا اخلاقی تعلیمات کو سختی سے لاگو کرنے کے نتیجے میں بھی بچے کے اندر بے جا احساسِ گناہ پیدا ہو سکتا ہے، خاص طور پر جب اسے نرمی اور رحمت کے بجائے صرف عذاب اور سزا کی تعلیم دی جائے۔

ان مسائل کا حل متوازن اور محبت بھرا رویہ اختیار کرنے میں ہے۔ والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ وہ بچوں کی حوصلہ افزائی کریں، ان کی غلطیوں کو ان کی

شخصیت پر حملہ کیے بغیر درست کریں، اور ان کی صلاحیتوں پر اعتماد بحال کرنے میں مدد کریں۔ بچوں کا موازنہ دوسروں سے کرنے کے بجائے ان کی اپنی ترقی پر توجہ دینی چاہیے اور ان کی کامیابیوں کو سراہنا چاہیے، چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہوں۔ جذباتی محرومی کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو غیر مشروط محبت دی جائے، اس کی بات کو سنا جائے اور اس کے جذبات کو اہمیت دی جائے۔ احساسِ گناہ کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو غلطیوں کی اصلاح کا موقع دیا جائے، انہیں یہ سمجھایا جائے کہ غلطی کرنا انسانی فطرت ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ناقص یا برا انسان ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی محبت اور تربیت میں اللہ کی رحمت، درگزر اور نرمی کے پہلو کو نمایاں کریں تاکہ بچہ خوف کے بجائے محبت کے جذبے کے تحت نیکی کی طرف مائل ہو۔

بچوں میں احساسِ کمتری، احساسِ محرومی اور احساسِ گناہ پیدا ہونے کے کئی نقصانات ہوتے ہیں جو ان کی ذہنی، جذباتی، تعلیمی اور سماجی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جب کوئی بچہ خود کو دوسروں سے کمتر محسوس کرنے لگے تو اس کے اندر خود اعتمادی ختم ہونے لگتی ہے، وہ اپنے فیصلوں پر یقین نہیں رکھتا اور دوسروں کے مقابلے میں خود کو کمزور سمجھنے لگتا ہے۔ اس کا

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ نئے چیلنجز کو قبول کرنے سے کتراتا ہے، اپنی قابلیت کو آزمانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے اور ناکامی کے خوف سے اپنی زندگی کے کئی مواقع کھو دیتا ہے۔ یہ احساس اس کی تعلیمی کارکردگی پر بھی منفی اثر ڈالتا ہے کیونکہ وہ اپنی محنت پر یقین نہیں رکھ پاتا اور مسلسل مایوسی کا شکار رہتا ہے۔ ایسے بچے سماجی محافل میں بھی پیچھے رہ جاتے ہیں، لوگوں سے ملنے جلنے میں ہچکچاتے ہیں اور بعض اوقات اتنے زیادہ شرمیلے ہو جاتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے اپنی بات تک کہنے سے گھبراتے ہیں۔ یہ احساس ان کے اندر جذباتی کمزوری پیدا کر دیتا ہے اور وہ اپنی بات کو ثابت کرنے کے بجائے دوسروں کے فیصلوں پر انحصار کرنے لگتے ہیں، جو بعد کی زندگی میں ان کے لیے مزید مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔

احساسِ محرومی بچوں میں چڑچڑاپن، حسد اور غصہ پیدا کر دیتا ہے۔ جب بچہ یہ دیکھتا ہے کہ دوسروں کو وہ سب کچھ حاصل ہے جو اسے نہیں ملا، تو وہ یا تو شدید حسد کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر مکمل مایوسی میں چلا جاتا ہے۔ بعض بچے اس احساس کے باعث بغاوت پر اتر آتے ہیں، وہ ضدی ہو جاتے ہیں اور ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ان کی خواہشات پوری نہ ہوں تو وہ چڑچڑے، غصیلا اور غیر متوازن رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔

احساسِ محرومی بعض اوقات بچوں کے اندر اخلاقی کمزوری پیدا کر دیتا ہے، وہ دوسروں کی چیزوں پر نظر رکھنے لگتے ہیں، غلط راستے اختیار کر لیتے ہیں یا اپنے دل کی محرومیوں کو پورا کرنے کے لیے غیر مناسب رویہ اپناتے ہیں۔ ایسے بچے بڑے ہو کر بھی ہر حال میں خود کو محروم ہی محسوس کرتے ہیں، چاہے انہیں دنیا کی ہر نعمت مل جائے، ان کے اندر تسکین اور اطمینان کا فقدان رہتا ہے اور وہ ہر وقت دوسروں کی زندگیوں کو دیکھ کر اپنی زندگی سے ناخوش رہتے ہیں۔

احساسِ گناہ بچوں کے ذہن پر خوف اور بے یقینی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ جب کسی بچے کو ہر وقت اس کی غلطیوں پر شرمندہ کیا جائے، اسے مسلسل ملامت کا سامنا ہو یا اس کی کسی کوتاہی کو معاف کرنے کے بجائے ہر بار اس کی طرف انگلی اٹھائی جائے تو وہ اپنے وجود کے بارے میں منفی سوچنے لگتا ہے۔ ایسے بچے اپنی فطری خوشیوں سے محروم ہو جاتے ہیں، ہر کام کرتے وقت انہیں یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ وہ غلطی کر رہے ہیں اور ان سے کوئی نہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ کسی بھی سرگرمی میں مکمل اعتماد کے ساتھ شامل نہیں ہو پاتے، اپنی صلاحیتوں کو دبانے لگتے ہیں اور بعض اوقات خود کو ناقابلِ معافی سمجھنے لگتے ہیں۔ بعض بچے اس احساس کے باعث

دین سے دور ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا، جبکہ کچھ بچے غیر ضروری شدت پسندی میں مبتلا ہو کر اپنی ذات پر سختی کرنا شروع کر دیتے ہیں، اپنی خوشیوں کو گناہ سمجھنے لگتے ہیں اور خود کو بے جا سزا دینے لگتے ہیں۔ اس احساس کے زیرِ اثر وہ سماجی تعلقات میں بھی کمزور ہو جاتے ہیں، دوسروں کے ساتھ گھلنے ملنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں اور خود کو تنہائی میں قید کر لیتے ہیں۔

یہ تینوں احساسات اگر کسی بچے کی شخصیت میں پختہ ہو جائیں تو وہ ایک غیر متوازن، کمزور اور منفی شخصیت کا مالک بن سکتا ہے۔ ایسے بچے بڑے ہو کر اپنی زندگی میں کوئی بڑا قدم اٹھانے سے ڈرتے ہیں، دوسروں پر انحصار کرتے ہیں اور معاشرتی طور پر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان احساسات سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کی پرورش محبت، حوصلہ افزائی اور مثبت رویے کے ساتھ کی جائے۔ انہیں ان کی غلطیوں پر مکمل طور پر گناہگار محسوس کرانے کے بجائے اصلاح کا موقع دیا جائے، ان کی محنت کو سراہا جائے اور ان کی شخصیت کو تقویت دی جائے تاکہ وہ خود کو ایک باصلاحیت، خودمختار اور متوازن فرد کے طور پر دیکھ سکیں۔

خود اعتمادی اور خودی کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو اس کی صلاحیتوں پر یقین دلایا جائے اور اس کی مثبت کوششوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ وہ بچوں کی غلطیوں پر انہیں کمتر محسوس کرانے کے بجائے ان کی اصلاح میں مدد کریں، ان کی خوبیوں کو اجاگر کریں اور انہیں اپنی قابلیت کو آزمانے کے مواقع فراہم کریں۔ بچے کی خودی کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے خود فیصلے کرنے کا موقع دیا جائے، تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور اپنی ذات پر بھروسہ پیدا کرے۔ انہیں سکھایا جائے کہ مشکلات زندگی کا حصہ ہیں اور ان سے گھبرانے کے بجائے سیکھنے اور آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ اسلام میں خودی اور خود اعتمادی کی بڑی اہمیت ہے، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: "اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی" (سورۃ النجم 39)۔ یہ آیت خودی کے تصور کو واضح کرتی ہے کہ کامیابی کا دارومدار اپنی محنت اور جدوجہد پر ہے، نہ کہ دوسروں کے سہارے پر۔

خود اعتمادی اور خودی کے مضبوط ہونے کے کئی فائدے ہیں۔ ایک خوداعتماد بچہ زندگی کے چیلنجز کا بہادری سے سامنا کرتا ہے، اپنے فیصلے خود کرتا ہے اور دوسروں پر غیر ضروری انحصار نہیں کرتا۔ اس کے اندر مسائل کو حل کرنے

کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے، وہ معاشرتی اور تعلیمی میدان میں نمایاں کارکردگی دکھاتا ہے اور جذباتی طور پر بھی زیادہ مستحکم رہتا ہے۔ ایسے بچے مثبت رویے اپناتے ہیں، دوسروں سے حسد یا خوف محسوس کرنے کے بجائے اپنی ترقی پر توجہ دیتے ہیں اور زندگی میں بہتر کارکردگی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ دینِ اسلام میں بھی خودی اور عزتِ نفس کی تعلیم دی گئی ہے، جیسا کہ امام علیؑ فرماتے ہیں: "جس نے اپنی قدر پہچان لی، وہ کبھی ذلیل نہیں ہوگا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خودی کی پہچان ہی درحقیقت کامیابی اور عزت کی بنیاد ہے۔

شادی، اولاد اور تربیت

دیر سے شادی یا جلد شادی، دونوں انسانی زندگی کے اہم فیصلوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے نتائج نہ صرف فرد کی ذات بلکہ اس کی نسل، خاندان، اور معاشرے پر بھی گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ اس موضوع کو اگر دینی، سماجی، نفسیاتی اور معاشی زاویوں سے دیکھا جائے تو حقیقت کے کئی پرت سامنے آتے ہیں جنہیں سادہ فیصلوں کے تناظر میں نہیں سمجھا جا سکتا۔

جلد شادی کو اسلام میں پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ جوانی وہ عمر ہے جب انسان کی فطری خواہشات اپنے عروج پر ہوتی ہیں اور اگر ان کا جائز راستہ مہیا نہ کیا جائے تو معاشرتی اور روحانی گراوٹ کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ نکاح کو فتنوں سے بچاؤ کا ذریعہ قرار دینا اس بات کی گواہی ہے کہ جلد شادی محض جسمانی تقاضے پورے کرنے کا نام نہیں بلکہ ایک روحانی، نفسیاتی اور سماجی تحفظ ہے۔

جلد شادی کا ایک اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب اولاد پیدا ہوتی ہے تو والدین خود بھی جوان اور متحرک ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ بچوں کی پرورش میں بہتر طور پر شریک ہو سکتے ہیں، کھیل کود، تعلیم و تربیت، ذہنی ہم آہنگی، اور وقت دینے میں وہ توانائی رکھتے ہیں جو بڑھاپے میں کمیاب ہوتی ہے۔

تاہم جلد شادی کے ساتھ اگر شعور، ذمہ داری اور معاشی تیاری نہ ہو تو یہ خود ایک سنگین غلطی بن سکتی ہے۔ اگر انسان نہ خود کفیل ہو، نہ زندگی گذارنے کا سلیقہ جانتا ہو، نہ ہی باہمی تعلقات کو نبھانے کی حکمت رکھتا ہو تو وہ نہ صرف اپنی زندگی کو الجھا لیتا ہے بلکہ اپنی اولاد کی زندگی میں بھی پیچیدگیاں بھر دیتا ہے۔ اس لیے صرف جلد شادی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ علم، ہنر، تربیت، اور فکری بلوغت کا ہونا ضروری ہے۔

دیر سے شادی کی بھی اپنی وجوہات ہو سکتی ہیں، جیسے تعلیم مکمل کرنا، مالی بنیادیں مضبوط کرنا، یا زندگی میں کسی خاص مقصد کی تکمیل۔ لیکن اگر دیر سے شادی کا مطلب یہ ہو کہ انسان اپنی فطری خواہشات کو دبائے، نفس پرستی کی طرف مائل ہو، یا جذباتی ٹھہراؤ کھو بیٹھے تو پھر یہ تاخیر نفس، جسم اور روح تینوں کے لیے مہلک بن سکتی ہے۔ دیر سے شادی کرنے والے والدین جب اولاد کی پرورش کے مرحلے میں آتے ہیں تو ان کے جسمانی اور ذہنی ذخائر کم ہونے لگتے ہیں۔ پینتالیس یا پچاس کی عمر میں پیدا ہونے والے بچوں کی عمر جب شعوری سطح پر داخل ہوتی ہے تو والدین اکثر یا تو بیمار، کمزور، یا زندگی کے اتنے تھکے ہوئے ہوتے ہیں کہ نہ صرف جسمانی طور پر تھک جاتے ہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے درکار استقامت بھی ماند پڑ چکی ہوتی ہے۔

تاہم یہاں بھی ایک توازن ہے۔ اگر دیر سے شادی کرنے والا جوڑا خود شعوری، علمی، فکری اور معاشی طور پر مستحکم ہو، تو وہ دیر سے ہونے والے بچے کو وہ تربیت اور رہنمائی دے سکتے ہیں جو اکثر جلد شادی کرنے والے کم تجربہ کار والدین نہیں دے پاتے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وقت، محبت، توجہ، علم اور روحانی اقدار کو بچوں کے اندر منتقل کریں۔

اصل مسئلہ نہ دیر سے شادی ہے نہ جلد شادی، اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو کس قدر شعور، تقویٰ، اور عملی حکمت کے ساتھ چلاتا ہے۔ والدین کے لیے سب سے بڑا فریضہ صرف بچوں کو دنیا میں لانا نہیں بلکہ ان کی روحانی، نفسیاتی اور عملی تربیت ہے۔ انہیں دنیا کی دوڑ کا مسافر بنانے سے پہلے انسان اور بندۂ خدا بنانا ضروری ہے۔ بچوں کو پیسہ کمانے کے ہنر سکھانا اہم ہے، لیکن اس سے پہلے سچ بولنے، عزت سے جینے، حق کا ساتھ دینے، نفس کی خواہشوں پر قابو پانے، اور اللہ پر توکل کرنے کا شعور دینا کہیں زیادہ ضروری ہے۔

اسی طرح بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ زندگی گذارنے کے فنون بھی سکھانا چاہیے، جیسے وقت کی قدر، محنت کی عزت، عاجزی، خودداری، شکرگزاری اور صبر۔ یہ سب باتیں صرف اسکولوں سے نہیں ملتیں بلکہ والدین کے عمل، انداز، طرزِ گفتگو اور روزمرہ زندگی سے بچے سیکھتے ہیں۔ اگر والدین خود علم و

حکمت کے متلاشی ہوں، تو اولاد بھی سیکھنے والی بنے گی۔ اگر والدین خود خوش اخلاق، دیندار، سادہ مزاج اور سچائی پر قائم ہوں، تو اولاد بھی ان کے نقش قدم پر چلے گی۔

ایک بات پھر وہی ہے کہ شادی کب کی گئی، یہ سوال بعد کا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا انسان خود کو شوہر، بیوی، باپ یا ماں کے طور پر تیار کر چکا تھا؟ کیا اس کے پاس صرف پیسہ تھا یا ساتھ میں علم، بصیرت، ہنر اور اخلاق بھی تھا؟ کیونکہ جو اولاد دنیا میں آتی ہے، وہ صرف گوشت پوست کی مخلوق نہیں بلکہ ایک امانت ہے، جس کا حساب روزِ قیامت بھی لیا جائے گا اور دنیا میں بھی اس کے اثرات نسل در نسل محسوس ہوں گے۔

صحیح وقت پر شادی اور اس کے ساتھ آنے والی ذمہ داریوں کی احسن ادائیگی دراصل انسان کو ایک باوقار، ذمہ دار، خاندانی اور فطری زندگی کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ وہ طرزِ حیات ہے جو شیطانی استعماری نظام کے مفاد میں ہرگز نہیں کیونکہ یہ نظام انسان کو غیر فطری، فردیت زدہ، شہوت پرست، مادہ پرست، خود غرض اور جذباتی طور پر ٹوٹا ہوا رکھ کر اپنے استحصالی مقاصد حاصل کرتا ہے۔ شادی ایک ایسا فطری بندھن ہے جو انسان کو جنسی آزادی کے دھوکے، جذباتی افراتفری، بے مہار تعلقات، اور اخلاقی زوال جیسے

جالوں سے نکال کر ایک پُر امن، بامقصد اور مرکزیت والی زندگی کی طرف لے جاتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو استعمار کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔

جب ایک نوجوان بروقت نکاح کر لیتا ہے، تو وہ جنسی بے راہ روی، زنا، فحاشی، اور معاشرتی انارکی سے بچ جاتا ہے۔ استعماری نظام کا ایک اہم ستون یہی ہے کہ نوجوان نسل کو جسمانی لذتوں، فلموں، سیریز، گیمز اور سوشل میڈیا کی لایعنی دنیا میں الجھا کر ان کے اندر کا قائد، سپاہی، مفکر اور مصلح دفن کر دیا جائے۔ صحیح وقت پر شادی اسی اندرونی استعداد کو محفوظ رکھتی ہے، اسے نکھارتی ہے، اور انسان کو سنجیدہ، کارآمد اور اجتماعی سطح پر مفید فرد بناتی ہے۔

ایک شادی شدہ مرد یا عورت جب اپنے خاندان، بیوی، شوہر اور بچوں کے لیے جیتا ہے تو وہ اپنی ذات سے نکل کر دوسروں کی ذمہ داری اٹھاتا ہے، جو کہ استعمار کے "میں، میرا، مجھے" والے انفرادی خود پرستی کے فلسفے کی نفی ہے۔

استعمار کا ایک بڑا ہتھکنڈہ "ڈیٹ" کلچر، "آزاد محبت"، "سنگل زندگی"، اور "پہلے کیریئر بعد فیملی" جیسے نظریات کو فروغ دے کر شادی کو ایک بوجھ، قید اور غیر ضروری چیز بنا دینا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ انسان خاندان جیسی محفوظ اور مضبوط اکائی میں جڑے کیونکہ ایک مضبوط خاندان فرد کو خود مختار بناتا ہے، اور خود مختار فرد کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شادی ایک ایسا قلعہ ہے جو نہ

صرف شیطان کی شہوانی یلغار سے بچاتا ہے بلکہ فرد کو عفت، حیاء، وفا، قربانی، اور تحفظ کے اصول سکھا کر روحانی و اخلاقی پختگی عطا کرتا ہے۔ جب انسان یہ صفات سیکھتا ہے تو وہ استعماری نظام کے بنائے ہوئے مصنوعی آئیڈیلز، لالچ، شہرت، عیش و عشرت، اور نفس پرستی کے جال سے آزاد ہو جاتا ہے۔

شادی کے بعد والدین بننے کا تجربہ، بچوں کی پرورش، ان کے لیے قربانی، ان کی تعلیم و تربیت میں حصہ لینا، اور خاندان کی بقا کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا انسان کو استعماری نظام کے بنائے ہوئے "تفریحی غلام" سے نکال کر ایک سنجیدہ معمارِ قوم بناتا ہے۔ جو انسان صبح سے شام تک صرف اپنی خواہشات کے لیے جیتا ہے، وہ کبھی نظام ظلم کے خلاف نہیں اٹھتا، لیکن جو اپنے خاندان، نسل، اور عقیدے کے لیے جیتا ہے، وہ اگر بیدار ہو جائے تو دنیا کو بدل سکتا ہے۔ یہی بیداری استعمار کے لیے خطرہ ہے۔

یوں صحیح وقت پر شادی اور اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی نہ صرف انسان کو ذاتی طور پر محفوظ کرتی ہے بلکہ اسے استعمار کے بنائے ہوئے ان تمام فکری، نفسیاتی اور تہذیبی جالوں سے نکالتی ہے جو انسان کو اپنا غلام بنائے رکھنے کے لیے بچھائے گئے ہیں۔ شادی، اگر دینی شعور اور فطری اصولوں کے تحت ہو، تو یہ استعماری نظام کی سب سے بڑی شکست ہے، کیونکہ یہ انسان کو "میں" سے

نکال کر "ہم" کی دنیا میں داخل کر دیتی ہے، اور یہی "ہم" وہ طاقت ہے جو دنیا کے فرعونوں کو لرزاں کر سکتی ہے۔

ورچوئل رییلٹی میں خودی کی گمشدگی کا علاج

جدید ٹیکنالوجی کی فطرت، انسان کی نفسیاتی ساخت، اور معاشرتی شعور کے درمیان تعلق ایک ایسا گہرا مسئلہ ہے جسے نظر انداز کرنا ہماری تہذیبی اور فکری خودکشی کے مترادف ہو سکتا ہے۔ آج انسان جن آلات کا استعمال کر رہا ہے، وہ محض مددگار ذرائع یا سہولیات فراہم کرنے والے اوزار نہیں رہے بلکہ خود ایک ایسی وجودی حقیقت بن چکے ہیں جنہوں نے انسانی "فاعل" کی حیثیت کو متزلزل کر کے رکھ دیا ہے۔ ماضی میں انسان آلات پر حاکم تھا، ان کے ذریعے فطرت سے ہم آہنگی کے ساتھ اپنی ضروریات پوری کرتا تھا، لیکن آج کا انسان آلات کے تابع بن چکا ہے۔ وہ ان کے ذریعے نہیں بلکہ ان کے زیرِ اثر سوچتا، محسوس کرتا اور تعلقات قائم کرتا ہے۔

جدید نفسیات اور سماجی نفسیات یہ تسلیم کرتی ہے کہ انسان کا شعور، اس کا خودی کا احساس، اور اس کی تعلقات سازی کی صلاحیت اس کے ماحول اور استعمال شدہ آلات سے شدید طور پر متاثر ہوتی ہے۔ جب بچے پیدائش سے ہی ڈیجیٹل اسکرینز کے ساتھ جڑ جاتے ہیں، جب رشتے مجازی رابطوں اور آڈیو ویژوئل تاثرات پر منحصر ہو جاتے ہیں، جب کھیل حقیقی میدان سے نکل کر ڈیجیٹل کرداروں کی بقاء کی جنگ میں تبدیل ہو جائے، تو انسان کا "میں" اپنی جسمانی

اور روحانی مرکزیت کھو بیٹھتا ہے۔ اس صورتحال میں انسانی نفسیات میں "Displacement of self" پیدا ہوتا ہے، جہاں ایک فرد اپنا آپ، اپنی شناخت، اور اپنے جذبات کو کسی بیرونی، غیر حقیقی، لیکن جذباتی طور پر وابستہ "اوتار" میں دیکھنے لگتا ہے۔ یہ اوتار صرف ویڈیو گیمز، سوشل میڈیا پروفائلز یا ورچوئل ریئلٹی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ آہستہ آہستہ روزمرہ کے فیصلوں، تعلقات اور احساسات کو بھی قابو میں لینے لگتا ہے۔

سماجی نفسیات کے مطابق، فرد کی شناخت اور اس کی سماجی فاعلیت کا زیادہ تر انحصار اس کے سوشل کنٹیکسٹ اور میڈیم آف ریلیشن پر ہوتا ہے۔ جب ان میڈیمز کو جدید سرمایہ دارانہ، انسان مرکز نظام نے قبضے میں لے لیا ہو، جہاں ہر تعلق، ہر جذبہ، ہر رویہ کسی نہ کسی ڈیجیٹل اور مصنوعی ساخت سے مشروط ہو، تو انسان نہ صرف اپنے ارد گرد کی دنیا کو مصنوعی طریقے سے دیکھنے لگتا ہے بلکہ وہ خود بھی اپنے اندر ایک مجازی حقیقت قائم کر لیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر خطرناک حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھی اس مصنوعی معیارات پر جانچنے لگتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ خود اپنے شعور سے اجنبی ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے، محسوس کرتا ہے اور فیصلے کرتا ہے، لیکن وہ یہ سب ایک ایسے شعور

کے ذریعے کرتا ہے جو اس کا اپنا نہیں، بلکہ ٹیکنالوجی کے متعین کردہ سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا جدید ٹیکنالوجی محض آلات کا مجموعہ ہے یا یہ ایک تہذیبی ایجنڈے کی تجسیم ہے؟ نفسیاتی تحقیق بتاتی ہے کہ ہر آلہ جس کے ساتھ انسان کا طویل اور گہرا تعامل ہو، انسان کی شخصیت میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ جب یہ آلہ کسی خاص تصورِ انسان، تصورِ فطرت، اور تصورِ کائنات کے زیر اثر تخلیق ہوا ہو، تو وہ خود بھی ان تصورات کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کا بنیادی سانچہ anthropocentric یعنی انسان مرکز اور utilitarian یعنی نفع بخش استعمال پر مبنی ہے۔ اس میں فطرت کو مردہ، خام اور بے جان مادہ سمجھ کر انسان کی خواہشات کے تابع کر دیا گیا ہے۔ اس تصور میں روحانیت، تعلق، اور فطرت کی معنویت کا کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ ایسے آلات نہ صرف انسان کی دنیا کو بلکہ اس کی داخلی دنیا کو بھی ایک ایسے ورچوئل اور ہائپر-رئیل ماحول میں لے جاتے ہیں، جہاں حقائق، احساسات اور معانی سب کچھ ضم ہو جاتا ہے۔

اس پس منظر میں یہ کہنا کہ ٹیکنالوجی نیوٹرل ہے، محض ایک سادہ لوحی ہے۔ جو ٹیکنالوجی انسانی احساس کو simulate کرتی ہے، جو رشتے create کرتی

ہے، جو کرداروں میں خودی کا انعکاس پیدا کرتی ہے، وہ نیوٹرل نہیں رہتی۔ وہ ایک تہذیبی مظہر بن جاتی ہے، اور انسان کو ایک نئی شناخت دیتی ہے۔ انسان جو کبھی زمین، آسمان، ہوا، پانی، خاندانی بندھن، محنت، دعا، اور سجدے سے جڑا ہوا تھا، آج وہ گرافکس، نوٹیفکیشن، اور لائکس کے جال میں گھرا ہوا ہے۔ اس کا شعور، اس کی جمالیات، اور اس کی اخلاقیات تک virtual اور functional بن چکی ہے۔

اب اگر اس تبدیلی کو صرف خارجی سطح پر تنقید کر کے چھوڑ دیا جائے، تو یہ محض جذباتی ردعمل ہو گا۔ ہمیں اس ٹیکنالوجی کی ontological یعنی وجودی سطح کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ ہم واجب الوجود اور ممکن الوجود کے درمیان رشتہ طے کرتے ہیں، ہمیں ورچوئل وجود کی نوعیت، اس کی حیثیت اور اس کے ساتھ اپنے تعلق کا فلسفیانہ و عرفانی تعین بھی کرنا ہو گا۔ یہ طے کرنا ہو گا کہ یہ نئی دنیا ہماری روح، ہمارے دل، اور ہماری اجتماعی عقل کو کس طرح متاثر کر رہی ہے، اور اس کا حل کیا ہمارے مابعد الطبیعیاتی اصولوں، روحانی تربیت اور تہذیبی خودی کے احیاء کے بغیر ممکن ہے؟ اگر ہم نے ان آلات کو صرف استعمال کے اوزار سمجھ کر قبول کیا، تو یہ جلد یا بدیر ہمارے

اخلاق، عقیدہ، روحانیت، اور انسانیت کو ایک ایسی نئی دنیا میں ضم کر دیں گے جہاں ہم خود اپنی پہچان کھو بیٹھیں گے۔

وقت آچکا ہے کہ ہم نہ صرف جدید ٹیکنالوجی کے فاعلی کردار پر سوال اٹھائیں بلکہ ایک ایسے متبادل فکری و تہذیبی ماڈل کی تلاش کریں جو انسان کو دوبارہ اپنے باطن، اپنی فطرت، اور اپنے رب سے جوڑ سکے۔ ورنہ ہم سب ایک ایسے سانچے میں ڈھل چکے ہوں گے جس کے خالق ہم نہیں بلکہ وہ مشینیں ہوں گی جنہیں ہم نے بظاہر خود ایجاد کیا تھا۔

اس مسئلے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں تاکہ ہم اس مسئلے کو صرف فکری انقباض یا خوف کی صورت نہ سمجھیں بلکہ ایک فعال و تعمیری طریقے سے اس کا سامنا کر سکیں۔

سب سے پہلے اس تصور کی بنیاد پر غور کیا جائے کہ آیا ٹیکنالوجی بذاتِ خود کوئی ایسی قوت ہے جو انسان کو مغلوب اور غیر فاعل بنا دیتی ہے؟ اس کا جواب جدید نفسیات، خاص طور پر سماجی نفسیات اور انسانی فاعلیت (agency) کے نظریات کی روشنی میں تھوڑا مختلف نکلتا ہے۔ انسان کسی بھی شے یا نظام سے اپنی نسبت خود طے کرتا ہے، چاہے وہ عبادت ہو، علم ہو، یا تکنیکی وسائل۔ اگر انسان اپنی فاعلیت کھو رہا ہے تو اس کی وجہ محض ٹیکنالوجی نہیں بلکہ اس کے

ساتھ جڑی ہوئی تربیتی، فکری اور تہذیبی کمزوریاں ہیں۔ اگر انسان اپنے فکری زاویے کو بدل کر ٹیکنالوجی کو اپنی خدمت میں لے آئے، جیسا کہ بعض دینی معاشروں میں ہوا، تو یہی ٹیکنالوجی انسان کی معنوی ترقی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس لیے اسے محض مغربی تہذیب کی جبری پیداوار سمجھ کر رد کر دینا یا اس پر وجودی اضطراب میں مبتلا ہو جانا ایک یک رُخی تنقید ہو گی۔

یہ دلچسپ نکتہ ہے کہ گھڑے کے پانی پر خدا کا شکر ادا کرنا اور واٹر ڈسپنسر پر انسانی حیرت کا اظہار دراصل اس بات کی غمازی ہے کہ جدید ٹیکنالوجی نے شکر گزاری کے الوہی رشتے کو انسان کی فنی مہارت سے بدل دیا ہے۔ یہ نکتہ بظاہر درست محسوس ہوتا ہے لیکن اس پر مزید غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مسئلہ ٹیکنالوجی کا نہیں بلکہ انسان کے شعور، تربیت اور تصورِ نعمت کا ہے۔ اگر انسان کو صحیح تربیت دی جائے کہ وہ ہر وسیلے کو اللہ کی طرف سے نازل کردہ "تسخیر کائنات" کا نتیجہ سمجھے تو واٹر ڈسپنسر بھی اسی طرح توحید کی نشانی بن سکتا ہے جیسے گھڑا تھا۔ یہاں ضرورت فکری تربیت کی ہے، نہ کہ ٹیکنالوجی سے فرار کی۔

اسی طرح، مجازی دنیاؤں (Hyper-reality, Simulated reality) پر جو اعتراض کیا گیا ہے، وہ بھی ایک خاص قسم کی فکری پریشانی کی نمائندگی

کرتا ہے جس کا تعلق Baudrillard جیسے فلسفیوں کے نظریات سے ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ویڈیو گیمز، سوشل میڈیا اور مجازی رشتے انسانی شعور کو ایک نئی جہت میں داخل کر چکے ہیں، جہاں حقیقت اور مجاز کے درمیان فرق مدہم ہو چکا ہے۔ لیکن انسانی نفسیات میں ایک اہم صلاحیت self-reflection بھی پائی جاتی ہے جو اسے ان حدود کو پہچاننے اور ان سے آزاد ہونے کی راہ دکھا سکتی ہے۔ اگر بچوں اور نوجوانوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ حقیقی 'میں' اور مجازی کردار میں فرق کیا ہے، تو وہ اپنی فاعلیت برقرار رکھ سکتے ہیں۔

مابعد الطبیعیاتی سطح پر Virtual existence کو واجب، ممکن اور ممتنع جیسے روایتی فلسفیانہ طبقات سے ماورا تسلیم کرنا ایک جرات مندانہ دعویٰ ہے، مگر اسے فلسفیانہ طور پر مضبوط کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہم وجود کی تعریف اور اس کے مراتب پر از سر نو غور کریں۔ کلاسیکی اسلامی فلسفہ میں وجود کی تشکیک اور مراتب کا تصور ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم ان نئی "وجودی سطحوں" کو بھی سمجھ سکیں اور ان کے ساتھ اپنا تعلق طے کر سکیں، بشرطیکہ ہم خود کو اس فکر پر آمادہ کریں۔ اگر ہم Virtual یا simulated realities کو واجب یا ممکن کے معیاری خانوں میں فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو شاید ہم ان

کی معنوی پیچیدگی اور اثرات کو نظر انداز کر دیں، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان کے ساتھ ایک غیر مقدس یا غیر متجاوز تعلق قائم کریں تاکہ ان کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی خود پر ان کا غلبہ نہ آنے دیں۔

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ انسان کو محض ایک مظلوم فاعل کے طور پر پیش کرنا جو ٹیکنالوجی کے آگے بے بس ہو گیا ہو، نہ تو نفسیاتی لحاظ سے درست ہے اور نہ ہی تاریخی طور پر۔ انسانی تمدن، مذہب، اخلاق، فلسفہ اور عرفان کی طویل روایت نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے ماحول کو معنویت دے سکتا ہے، بشرطیکہ وہ خود اپنے وجود اور مقصدِ حیات سے واقف ہو۔ لہٰذا، جدید ٹیکنالوجی کے بارے میں ایک متوازن، باشعور اور تنقیدی رویہ ہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے ہم اس کے خطرات کو کم کر کے اس کے امکانات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ فکری بے چینی کو اصلاحِ فکر اور تربیتِ فاعلیت کی طرف موڑنے کی ضرورت ہے، نہ کہ اسے تقدیری مظلومیت کا عنوان دے کر جمود کا شکار ہونے کی۔

بچوں اور نوجوانوں کی سیاسی تربیت

بچوں اور نوجوانوں کی سیاسی تربیت ایک حساس، تدریجی اور ہمہ جہت عمل ہے، جو محض سیاسی معلومات دینے یا پارٹی نظام سے متعارف کروانے کا نام نہیں بلکہ ان کے اندر ایک فکری، اخلاقی اور تمدنی شعور بیدار کرنے کا نام ہے، تاکہ وہ اپنے زمانے، معاشرتی نظام، ملکی پالیسیوں، عالمی طاقتوں اور ان سب کے باہمی تعلقات کو ایک واضح نظر کے ساتھ دیکھ سکیں۔ سیاسی تربیت کا مقصد صرف یہ نہیں کہ نوجوان حکومت کی تنقید کرنا سیکھ جائیں یا جلسوں میں شرکت کریں، بلکہ اس کا اصل ہدف یہ ہے کہ وہ حق و باطل کے نظاموں میں فرق کر سکیں، اپنی قوم و ملت کی عزت اور خودمختاری کو پہچانیں، اور اپنے کردار کو ذمہ دار شہری کے طور پر متعین کریں۔

سیاسی تربیت کی بنیاد بچوں کی فطری عقل، مشاہدہ، سوالات اور تجسس پر رکھنی چاہیے۔ بچہ جب کسی کھیل میں قانون کی خلاف ورزی دیکھتا ہے، جب اسے اسکول میں استاد یا ساتھیوں کے درمیان ناانصافی محسوس ہوتی ہے، جب اسے یہ سمجھ آتا ہے کہ کس طرح کوئی طاقتور کمزور کو دبا رہا ہے، تو دراصل وہ سیاسی شعور کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ ان مراحل پر والدین اور اساتذہ اگر گہرائی اور حکمت کے ساتھ بچے کی رہنمائی کریں، اس کے

مشاہدے کو درست الفاظ میں بیان کرنے کی تربیت دیں، اور اس کی فکر کو نظم عطا کریں، تو یہیں سے اس کی سیاسی تربیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

نوجوانوں کے لیے سیاسی تربیت کا پہلا قدم اپنی تاریخ، تمدن، دین اور قوم کی صحیح شناخت ہے۔ جو نوجوان اپنے قومی ورثے، دینی اقدار اور تہذیبی تشخص سے جڑا ہوا ہو، وہی حقیقی سیاست کا فہم حاصل کر سکتا ہے، کیونکہ سیاست محض اقتدار کا نام نہیں بلکہ اقدار کی ترجمانی کا میدان ہے۔ اگر نوجوان محض مغربی جمہوریت کے بت میں گرفتار ہو جائے، یا صرف میڈیا سے حاصل شدہ اطلاعات کو حقیقت سمجھ لے، تو اس کی سیاست سطحی اور وقتی ردعمل پر مبنی ہو گی۔ چنانچہ نوجوان کو یہ سکھایا جائے کہ سیاست کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر بات کے پیچھے موجود محرکات، مفادات اور نظریات کو سمجھے، اور ہر اقدام کو دین، عدل، انسانیت اور ملت کے مفاد کی کسوٹی پر پرکھے۔

نوجوانوں کی سیاسی تربیت میں قصے، سوانح عمریاں، انقلابی تحریکوں کی تاریخ، اور مظلوم اقوام کے تجربات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جب ایک نوجوان یہ پڑھتا ہے کہ کس طرح فلسطین، کشمیر، عراق، یمن یا افریقی اقوام نے استعماری طاقتوں کے خلاف جدوجہد کی، یا کس طرح امام خمینیؒ نے ایک استبدادی حکومت کے خلاف عوام کو بیدار کیا، یا کس طرح امام حسینؑ نے چند

افراد کے ساتھ ایک طاغوتی نظام کو چیلنج کیا، تو اس کی رگوں میں خودی، غیرت اور سیاسی بصیرت کا خون دوڑنے لگتا ہے۔ لیکن ان موضوعات کو محض رٹی رٹائی معلومات کے طور پر پیش کرنے کے بجائے ایک زندہ، سوال انگیز اور جذبات انگیز انداز میں بیان کیا جانا ضروری ہے۔

سیاسی تربیت کا ایک اہم پہلو زبان اور گفتگو کی تربیت بھی ہے۔ نوجوان جب تک اپنے خیالات کو مہذب، مدلل اور جرأت مندانہ انداز میں بیان نہیں کر سکتا، وہ سیاسی میدان میں مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے مکالمہ، مباحثہ، مطالعہ اور تحریر کی تربیت بنیادی ہے۔ نوجوان کو اخبارات پڑھنے، تجزیے لکھنے، اور علمی اختلافات کو برداشت کرنے کا سلیقہ سکھانا ایک طرح سے اس کے اندر جمہوری تربیت کو پروان چڑھانا ہے، لیکن اس جمہوریت کو محض مغربی ماڈل کے طور پر نہیں بلکہ اسلامی اصولوں کے تحت سکھایا جانا چاہیے، جہاں حاکمیت صرف عوام کو نہیں بلکہ خدا کو حاصل ہے، اور حکمرانی اس کے اصولوں کے تحت ہی جائز سمجھی جاتی ہے۔

بچوں اور نوجوانوں کی سیاسی تربیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ انہیں اپنے مقامی مسائل کے ساتھ جوڑا جائے۔ گلی محلے کے مسائل، اسکول کی ناانصافیاں، بلدیاتی نظام، اور روزمرہ کی حکومتی بے ضابطگیاں ان کے لیے تربیتی مواقع

ہیں۔ اگر انہیں یہ سکھایا جائے کہ وہ ان مسائل کو صرف ذاتی تکلیف نہ سمجھیں بلکہ ایک اجتماعی مظہر کی صورت میں دیکھیں، تو ان کی فکر وسیع ہو جاتی ہے۔ جب وہ جانتے ہیں کہ مہنگائی صرف ان کے گھر کی پریشانی نہیں بلکہ ایک حکومتی اور عالمی پالیسی کا نتیجہ ہے، تو ان کے اندر سوال، تحقیق اور تبدیلی کی آرزو جنم لیتی ہے۔

سیاسی تربیت کا ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ نوجوانوں کو مایوسی اور جذباتی شدت سے بچایا جائے۔ اگر وہ صرف تنقید اور نفرت سیکھیں، یا ہر مسئلے کو محض سازش اور دشمنی سے تعبیر کریں، تو وہ عمل سے کٹ جاتے ہیں، اور یا تو انتہا پسند بن جاتے ہیں یا بے عمل۔ اس لیے ان کی تربیت میں امید، صبر، تدبیر اور تنظیم کو بنیادی حیثیت دی جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ ایک باخبر اور بابصیرت فرد کا کام صرف تنقید نہیں بلکہ تعمیر، فقط احتجاج نہیں بلکہ تجویز، اور صرف جزبہ نہیں بلکہ حکمت کے ساتھ قیادت بھی ہے۔

آخر میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی سیاسی تربیت صرف اسکول، نصاب یا تربیتی ادارے کا کام نہیں، بلکہ ہر ماں باپ، ہر مسجد، ہر گھر، اور ہر معلم کی ذمہ داری ہے۔ جب ہر بزرگ یہ سمجھے کہ ایک باشعور نوجوان دراصل ایک محفوظ مستقبل کی ضمانت ہے، تو وہ اپنی روزمرہ کی بات

چیت، فیصلوں، طرزِ عمل اور گفتگو کو اس انداز میں تبدیل کرے گا کہ ہر لمحہ تربیت بن جائے۔ اور جب ایک نوجوان اپنی زندگی کو فقط تعلیم، روزگار یا تفریح تک محدود نہ کرے بلکہ اسے ایک عظیم مقصد، عادلانہ نظام، اور خدا کے نمائندہ کی حکومت کے قیام کے لیے وقف کرے، تو تب ایک نئ نسل وجود میں آتی ہے—جو فقط سیاست نہیں، بلکہ امامت کی تمہید بن سکتی ہے۔

سیاسی تربیت کو مؤثر بنانے کے لیے محض نظریاتی گفتگو یا معلوماتی انداز کافی نہیں ہوتا بلکہ وہ طریقے، ماحول، فضا اور اسلوب درکار ہوتا ہے جو ایک بچے یا نوجوان کے ذہن، دل اور احساسات پر اثر انداز ہو، اس کی روح کو جھنجھوڑ دے، اور اسے عمل کی تحریک دے۔ چنانچہ وہ تمام ٹیکٹکس جو اس مقصد کو حاصل کرنے میں مدد دیں، انہیں نہ صرف نفسیاتی سطح پر کارآمد ہونا چاہیے بلکہ ان کی جڑیں اسلامی مصادر میں بھی پیوست ہوں، تاکہ یہ تربیت محض وقتی جوش یا احتجاجی جذبہ نہ بنے بلکہ ایک روحانی، فکری اور عملی سفر کا آغاز کرے۔

سب سے پہلا اور بنیادی طریقہ یہ ہے کہ بچے کے دل میں عدل کا عشق اور ظلم سے نفرت پیدا کی جائے۔ یہ عشق و نفرت فقط زبانی نصیحت سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بار بار تجربے، مشاہدے، قصوں، اور خود بڑوں کے طرزِ عمل سے تشکیل پاتے ہیں۔ اگر بچہ یہ دیکھے کہ ماں باپ کسی

بے انصافی پر خاموش نہیں رہتے، گھر میں فیصلے عدل و مشورے سے ہوتے ہیں، استاد طالبعلم کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتا ہے، اور کسی غریب یا مظلوم کو ترجیح دی جاتی ہے، تو یہ تمام چھوٹے واقعات مل کر بچے کے اندر عدل کے لیے محبت اور ظلم کے لیے ایک فطری نفرت پیدا کرتے ہیں۔ یہ وہ پہلا دروازہ ہے جو سیاست کے فہم کی جانب کھلتا ہے، کیونکہ سیاست در حقیقت معاشرے میں عدل و ظلم کے توازن کی جنگ ہے۔

دوسرا موثر طریقہ کہانی، تمثیل اور کردار کی تربیت ہے۔ ایک بچہ کسی کتابی اصول سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا ایک کردار سے ہوتا ہے۔ جب امام علیؑ کے فیصلے سنائے جائیں، جیسے ان کا اپنے بھائی عقیل کو بیت المال سے اضافی لینے پر انکار، یا امام حسینؑ کی مدینہ سے کربلا کی ہجرت کا قصہ جس میں انہوں نے ظالم حکومت کے خلاف قیام کو ترجیح دی، یا حضرت فاطمہؑ کا دربار میں خطبہ جس میں انہوں نے غصب خلافت پر سیاسی احتجاج کیا—یہ سب روایات نہ صرف بچوں کو سکھاتی ہیں کہ سیاست کسے کہتے ہیں، بلکہ انہیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ دیانت، شجاعت اور بصیرت کا کیا مطلب ہے۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت شعیبؑ اور خود رسول اکرمؐ کی اقوام کے

خلاف قیام کو بار بار بیان کیا گیا ہے، جو بتاتا ہے کہ نبوت اور سیاست الگ الگ میدان نہیں بلکہ ایک ہی مقصد کے دو پہلو ہیں: ظلم کا انکار اور عدل کا قیام۔

بچے اور نوجوان جب صرف نصابی تعلیم کے ذریعے نہیں بلکہ ڈرامہ، تھیٹر، تعلیمی مشق، تصویری خاکے، سوال و جواب کی نشست، اور ہنر و فن کے ذریعے ان عظیم کرداروں کو زندہ حالت میں محسوس کریں، تو ان کے اندر ایک داخلی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ یہ حرکت ایک دن نعرے کی شکل اختیار کرتی ہے، دوسرے دن کسی ظالم کے خلاف کھڑے ہونے میں، اور تیسرے دن اپنے اندر قیادت، فہم اور استقلال کے جذبات کو جنم دیتی ہے۔

ایک اہم اور عملی ٹیکٹک یہ ہے کہ بچوں کو چھوٹے چھوٹے معاشرتی مسائل میں شرکت کا موقع دیا جائے۔ محلے میں صفائی مہم ہو، اسکول میں ناانصافی کے خلاف پٹیشن ہو، کسی مظلوم طالبعلم کے حق میں آواز اٹھانی ہو، یا کسی یتیم کے حق میں فنڈ اکٹھا کرنا ہو—یہ تمام سرگرمیاں دراصل بچوں کی سیاسی تربیت کے ابتدائی عملی مراحل ہیں۔ جب انہیں بتایا جائے کہ حق کے لیے خاموشی جرم ہے، اور قیام صرف کربلا کا عمل نہیں بلکہ روزمرہ زندگی کا تقاضا ہے، تو ان کے اندر عمل کا جذبہ شعور کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ امام صادقؑ کی یہ روایت کہ "جو شخص اپنے زمانے کے امام کو پہچانے بغیر مر جائے، وہ جاہلیت کی موت

مرتا ہے" دراصل اس بات پر زور دیتی ہے کہ زمانے کی سیاسی و دینی شناخت، ایک فرد کے ایمان کی بقا کے لیے لازم ہے۔

اسلامی تعلیمات میں بارہا "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کو دین کی روح کہا گیا ہے۔ یہ عمل در حقیقت سیاسی تربیت کا جوہر ہے۔ جب بچے کو سکھایا جائے کہ اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا فقط ذاتی اخلاق نہیں بلکہ اجتماعی ذمہ داری ہے، تو وہ آہستہ آہستہ معاشرتی مسائل میں دلچسپی لینا شروع کرتا ہے۔ اسے یہ بتانا کہ ظلم کے خلاف خاموشی ظلم کی تائید ہے، اس کے دل کو متحرک کرتا ہے۔ قرآن میں بار بار ظالموں کی حمایت سے منع کیا گیا ہے، حتیٰ کہ ظالم کی طرف جھکنے سے بھی روکا گیا ہے: "ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار" — یعنی جو ظلم کرنے والوں کی طرف جھکتے ہیں، ان کو بھی آگ پکڑ سکتی ہے۔

بچوں کی تربیت میں سب سے گہری تاثیر اساتذہ اور والدین کے چہرے، لہجے اور طرزِ عمل سے آتی ہے۔ اگر بچہ دیکھے کہ اس کا استاد کرپشن کو برائی نہیں سمجھتا، یا باپ خود کسی سیاسی مفاد کے لیے جھوٹ بولنے یا رشوت دینے سے گریز نہیں کرتا، تو تمام کہانیاں، روایات اور خطبات بے اثر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا موثر سیاسی تربیت کے لیے ایک ایسا ماحول ضروری ہے جہاں صداقت،

دیانت، شجاعت، اور حق گوئی کو عملی طور پر دکھایا جائے، نہ کہ صرف پڑھایا جائے۔

نوجوانوں کے لیے بحث، مکالمہ، انٹرایکٹو لیکچرز، ویڈیوز، اور حالات حاضرہ پر اسلامی تجزیہ بھی لازمی ٹیکٹکس میں شامل ہے۔ انہیں یہ سکھایا جائے کہ خبروں کو کیسے سمجھنا ہے، میڈیا کس طرح رائے سازی کرتا ہے، اور عالمی سیاست میں استعمار، صہیونیت، اور سامراج کا کیا کردار ہے۔ جب وہ دنیا کے نقشے کو فقط جغرافیہ نہیں بلکہ مظلوم و ظالم کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو ان کے اندر عالمی شعور جنم لیتا ہے، جو انہیں فقط ملکی سیاست تک محدود نہیں رہنے دیتا بلکہ امتِ مسلمہ اور انسانی برادری کی سطح پر ایک قائدانہ سوچ سے آراستہ کرتا ہے۔

آخر میں دعا، مناجات اور روحانی وابستگی بھی سیاسی تربیت کا حصہ ہے۔ جب نوجوان شب بیداری میں خدا سے عادل نظام کی دعا کرتا ہے، امام مہدیؑ کے ظہور کے لیے آنسو بہاتا ہے، اور خود کو اس کے لشکر کا سپاہی سمجھتا ہے، تو اس کی روح میں جو تڑپ پیدا ہوتی ہے وہ ہزاروں تقاریر سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ لہٰذا موثر سیاسی تربیت وہی ہے جو عقل، دل، عمل اور روح؛ چاروں کو بیک وقت مخاطب بنائے—اور یہی تربیت ہے جو ایک نوجوان کو فقط باشعور شہری نہیں بلکہ امام زمانہؑ کا حقیقی منتظر اور ناصر بناتی ہے۔

ظالمانہ نظام کے خلاف بچوں کی بیداری

بچوں کی تربیت ایک ایسا عمل ہے جو محض انفرادی کردار سازی تک محدود نہیں بلکہ معاشرتی، تمدنی اور سیاسی شعور کی منتقلی کا بھی ذریعہ ہونا چاہیے۔ ایک ایسا بچہ جو اپنی ذات، خدا اور انسانیت سے مربوط فہم رکھتا ہو، وہی آگے چل کر ایک باخبر اور باعمل شہری بن سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچے صرف نیک، صالح اور نماز پڑھنے والے نہ ہوں بلکہ ظالم نظام کے خلاف اٹھنے والے، معاشرے کی اصلاح کیلئے کمربستہ اور ایک عادلانہ حکومت کے قیام کیلئے متحرک ہوں، تو ہمیں ان کی تربیت ایک وسیع تر فکری، اخلاقی اور تمدنی پس منظر کے ساتھ کرنی ہوگی۔

بچے فطرت کے قریب ہوتے ہیں، ان کا دل حق و باطل کی پہچان کے لیے حساس اور ان کی روح عدل و ظلم کے فرق کو محسوس کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ ہمیں ان کی اس فطری صلاحیت کو تعلیم و تربیت کے ذریعے نکھارنا ہے۔ بچپن سے ہی انہیں یہ سکھایا جائے کہ دنیا میں دو طرح کے نظام ہوتے ہیں: ایک وہ جو انسانوں کو غلام بناتا ہے، ان کی آزادی چھینتا ہے، جھوٹ اور فریب پر قائم ہوتا ہے؛ اور دوسرا وہ جو خدا کے دیے ہوئے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے، جہاں انسان عزت، عدل، اخوت اور امانت کے ساتھ جیتے ہیں۔ یہ فرق صرف

کتابوں یا کہانیوں میں نہ ہو، بلکہ روزمرہ کی زندگی، معاشرے کے مشاہدے اور گھریلو گفتگو میں بھی محسوس کروایا جائے۔

بچوں کے سامنے ظلم کو صرف ایک اخلاقی برائی کے طور پر پیش نہ کریں، بلکہ یہ واضح کریں کہ ظلم کا منبع کون ہے، نظام ظلم کیسے کام کرتا ہے، اور خاموشی کس طرح اس ظلم کا حصہ بن جاتی ہے۔ انہیں سادہ مثالوں کے ذریعے بتایا جائے کہ اگر کسی اسکول میں استاد غلط فیصلے کرے، بچوں میں تفریق کرے، جھوٹ بولے یا کسی کمزور کو دبائے تو کیا یہ درست ہے؟ پھر اس بات کو معاشرتی سطح پر پھیلایا جائے کہ اگر ہماری حکومت اسی طرح ظلم کرتی ہے، کرپشن پھیلاتی ہے، دولت مندوں کو فائدہ اور غریبوں کو نقصان دیتی ہے، تو یہ کیسا نظام ہے؟ اس سوال کے ذریعے ان کے اندر ایک فکری اضطراب پیدا کیا جائے، جو محض شکایت نہ ہو بلکہ تبدیلی کی سمت میں ایک حرکت پیدا کرے۔

اہم یہ ہے کہ بچوں کو صرف احتجاج یا تنقید کی تربیت نہ دی جائے، بلکہ انہیں یہ سکھایا جائے کہ ایک بہتر نظام کیسا ہو سکتا ہے۔ ان کے دل میں عادل حکومت، خدا پر مبنی قیادت، اور امام مہدیؑ کی حکومت کا خواب جگایا جائے۔ اس خواب کو صرف ایک دیومالائی تصور نہ بننے دیں، بلکہ عملی زندگی میں اس کی جھلک دکھائیں۔ مثلاً گھر میں فیصلے مشورے سے ہوں، انصاف قائم ہو، بڑوں کی

غلطی پر معافی مانگی جائے، اور اموال میں امانت داری ہو—تاکہ بچہ یہ سمجھے کہ عدل ایک زندہ حقیقت ہے، اور اسے قائم کرنا ممکن ہے۔

پھر جیسے جیسے بچہ شعور کی منازل طے کرے، اس سے بات کی گہرائی بھی بڑھتی جائے۔ قرآن کی آیات، انبیاءؑ کی جدوجہد، امام علیؑ کی خطابات، امام حسینؑ کی قربانی، اور امام مہدیؑ کے عدل کی بشارت—یہ سب اس کی فکری تربیت کا حصہ بنیں۔ اس تربیت میں نہ جذباتی شدت ہو نہ مایوسی، بلکہ ایک امید، حکمت اور تدریج کا پہلو غالب ہو۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ آئندہ نسلیں ظلم پر خاموش نہ رہیں، تو ہمیں اپنے گھروں، اسکولوں، مساجد اور ہر تربیتی ادارے میں حکومت، سیاست، عدل، حق اور باطل جیسے الفاظ کو دوبارہ متحرک مفاہیم کے ساتھ زندہ کرنا ہوگا۔ بچے صرف تعلیمی بورڈز کے لیے نہیں بلکہ امام زمانہؑ کے لشکر کے سپاہی بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں، ہمیں ان کی تربیت اسی سوچ کے تحت کرنی ہے۔

بچوں کی ذہن سازی محض معلومات کی منتقلی کا عمل نہیں بلکہ ایک گہرے نفسیاتی، جذباتی، لسانی اور عملی تربیتی نظام کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ بچوں کے ساتھ جس انداز میں بات کی جائے، جو طرزِ عمل والدین، اساتذہ اور بزرگ اختیار کریں، وہی اصل میں بچوں کے اندر کسی بات کی اہمیت یا بے اہمیتی کا سبب بنتا

ہے۔ جب ہم چاہتے ہیں کہ بچے کرپٹ نظام سے نفرت کریں، عدل کی حکومت کے لیے تڑپ پیدا کریں، مہنگائی اور بد دیانتی جیسے مسائل کو محض شکوہ و شکایت نہیں بلکہ ایک اجتماعی المیے اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ سمجھیں، تو ہمیں ان سے بات کرنے کا انداز بدلنا ہو گا۔

سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ بچوں کو نصیحتوں، ڈانٹ ڈپٹ یا لیکچر سے متاثر نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی دنیا مشاہدے، احساس، کہانی اور کردار سے بنتی ہے۔ اگر کوئی باپ یا ماں مسلسل مہنگائی کی شکایت کرے، حکومتی کرپشن پر تنقید کرے لیکن خود بازار میں جھوٹ بولے، دو نمبر چیز خریدے، یا گھر میں بچوں کی بات سنے بغیر فیصلے کرے، تو بچہ سیکھتا یہی ہے کہ باتیں کچھ اور ہیں، عمل کچھ اور۔ لہٰذا بچے کو متاثر کرنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ جو باتیں ہم اس سے چاہتے ہیں، وہ پہلے ہم خود اپنے عمل میں دکھائیں۔

مثال کے طور پر اگر بچہ دیکھے کہ اس کے والد جب سبزی خریدتے ہیں تو دوکاندار سے تول میں کمی پر نرمی سے لیکن اصولی احتجاج کرتے ہیں، یا جب کسی ادارے میں سفارش سے کام کروانے کا موقع آتا ہے تو وہ انکار کرتے ہیں، یا وہ وقت پر بجلی یا گیس کا بل دیتے ہیں، تو یہ سب خاموش لیکن گہرے اسباق ہوتے ہیں۔ بچے باتوں سے زیادہ رویوں سے سیکھتے ہیں۔

بچوں سے جب حکومت یا کرپشن جیسے بڑے موضوعات پر گفتگو کی جائے تو اسے ان کی عمر، احساس اور زبان کی سطح پر لایا جائے۔ ان سے سوال پوچھے جائیں، مثلاً "بیٹا اگر آپ کی کلاس میں استاد امیر بچوں کو نمبر دے دے اور محنتی مگر غریب بچے کو کم دے، تو آپ کو کیسا لگے گا؟"، یا "اگر ہم لائن میں لگے ہوں اور کوئی آدمی پیسے دے کر آگے چلا جائے، تو کیا یہ انصاف ہے؟"۔ جب بچہ خود ظلم کو محسوس کرے گا، وہی احساس آگے چل کر نظام کے خلاف سوال کی صورت اختیار کرے گا۔

کہانیاں اس عمل میں بہت مؤثر ذریعہ ہیں۔ چاہے وہ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن کی کہانیاں ہوں جن میں انہوں نے مکہ کے ظالم سرداروں کے مقابلے میں کمزوروں کا ساتھ دیا، یا امام علیؑ کی حکومت کے قصے ہوں جن میں بیت المال سے چراغ بجھایا جاتا تھا، یا امام حسینؑ کا وہ فیصلہ کہ جب سب خاموش تھے تو انہوں نے قیام کیا—یہ سب کہانیاں بچوں کے اندر ایک اخلاقی ستون قائم کرتی ہیں۔ لیکن انہیں سنانے کا انداز قصہ گوئی کا ہونا چاہیے، نہ کہ نصیحت کا۔ والدین کو چاہیے کہ وہ رات کو کہانی سناتے وقت اس میں کوئی ایسا کردار شامل کریں جو کسی ناانصافی کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے، چاہے وہ فرضی کردار ہو یا تاریخی۔

مہنگائی جیسے مسائل بچوں کو اس انداز میں سمجھائے جاسکتے ہیں کہ "بیٹا، دیکھو آج کل چیزیں بہت مہنگی ہو گئی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کے حکمران لوگوں کی دولت کو صحیح جگہ استعمال نہیں کرتے، وہ اپنی تجوریاں بھرتے ہیں، غریبوں کا حق دباتے ہیں، اس لیے تمہیں اگر ہم کچھ چیزیں نہیں لا پاتے تو اس کی وجہ یہ نظام ہے، اور ہمیں دعا کے ساتھ کوشش بھی کرنی ہے کہ ہم ایسے حکمران پیدا کریں جو خدا سے ڈرتے ہوں۔" یہ انداز شکایت کا نہیں بلکہ شعور بیدار کرنے کا ہونا چاہیے۔

بچوں کے ساتھ روزمرہ کا رویہ ایسا ہو کہ وہ سوال پوچھ سکیں، انکار کر سکیں، سوچ سکیں، اور اپنے جذبات کے اظہار کی اجازت محسوس کریں۔ جب والدین بچوں کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اپنے دل کی بات کریں، سوال کریں، اختلاف کریں تو دراصل وہ انہیں ایک ذمہ دار اور باشعور انسان بنا رہے ہوتے ہیں۔ جب بچہ دیکھتا ہے کہ اس کی بات کو اہمیت دی جا رہی ہے، تو وہ دوسروں کی بات کو بھی سننے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر والدین محض حکم دیتے ہیں، یا بات بات پر جھڑکتے ہیں، تو بچہ ان کے اصولوں سے فاصلہ اختیار کر لیتا ہے، خواہ وہ اصول کتنے ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں۔

بچوں کو اعتماد دینا کہ وہ اپنے محلے میں کسی غلط کام پر آواز اٹھا سکتے ہیں، اسکول میں سفارش یا دھونس پر سوال کر سکتے ہیں، یا کمزور ساتھی کا ساتھ دے سکتے ہیں، دراصل یہ انہیں ایک چھوٹے پیمانے پر نظام بدلنے والا انسان بناتا ہے۔ اگر وہ بچپن میں یہ چھوٹے قیام نہ کریں، تو بڑے ہو کر کسی ظلم کے خلاف کھڑا ہونا ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

لہٰذا بچوں کی تربیت، کہ وہ کرپٹ نظام سے نفرت کریں اور ایک عادلانہ حکومت کے لیے متحرک ہوں، اس وقت ممکن ہے جب ہم ان کی فطرت کو جھنجھوڑیں، ان کے احساس کو بیدار کریں، ان کے مشاہدے کو شعور میں بدلیں، ان کے سوالات کو دبانے کے بجائے سراہیں، اور اپنی زندگی سے وہی اخلاقیات ظاہر کریں جن کا ہم ان سے تقاضا کرتے ہیں۔ یہ تدریجی، محبّت بھرا اور باوقار عمل ہے، اور یہی عمل آئندہ نسل کو امام زمانہؑ کے منتظر سے اس کے ناصر اور مددگار میں تبدیل کرتا ہے۔

موجودہ تعلیمی نظام اور علم کا اسلامی نظریاتی ماڈل

آج کے تعلیمی اداروں کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ علم کو محض ایک پروڈکٹ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں نصاب کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ مارکیٹ میں روزگار حاصل کر سکیں یا سرمایہ دارانہ نظام کے لیے کارآمد بن جائیں۔ اس ڈھانچے میں علم کی حیثیت ایک "سرمایہ کاری" جیسی ہے، جہاں طلبہ کو سرمایہ کاری کا آلہ سمجھا جاتا ہے تاکہ وہ کل کو کارپوریشنز اور انڈسٹریز کے مفاد میں خدمات انجام دے سکیں۔ لیکن اس طریقے نے علم کی اصل حقیقت اور اس کے الٰہی پہلو کو دھندلا کر رکھ دیا ہے۔ علم، جسے قرآن نے نور اور بصیرت کہا ہے، اور جسے احادیث نے امانت اور قربِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیا ہے، وہ اگر محض پیسہ کمانے کا وسیلہ بن جائے تو اپنی روح اور حقیقت کھو دیتا ہے۔

علم کو الٰہی امانت کے طور پر برتنا اس وقت ممکن ہے جب ہم تعلیم کو صرف معاشی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ نہ سمجھیں بلکہ اسے ایک ایسی ذمہ داری مانیں جس کا مقصد انسان کو خدا کے قریب کرنا، حق و باطل میں فرق پیدا کرنا اور انسانی خدمت کو فروغ دینا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیاوی روزگار اور

معاش کو ترک کر دیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاش کمانے کا عمل بھی بندگیِ خدا اور خدمتِ خلق کی نیت سے ہو، نہ کہ حرص و طمع یا صرف دنیاوی فائدے کے لیے۔

ایک ڈاکٹر اگر اپنے علم کو محض پیسہ بنانے کے لیے استعمال کرے تو وہ علم کی خیانت کرتا ہے، لیکن اگر وہ مریض کی جان بچانے اور انسانیت کی خدمت کے جذبے سے طبابت کرے تو اس کا علم عبادت بن جاتا ہے۔ ایک انجینئر اگر اپنی مہارت کو صرف بڑی کمپنیوں کے منافع بڑھانے کے لیے لگائے تو یہ علم کا تجارتی استعمال ہے، لیکن اگر وہ اپنے فن کو عدل، سہولت اور معاشرے کی بہتری کے لیے بروئے کار لائے تو یہ الٰہی امانت کی ادائیگی ہے۔ اسی طرح ایک استاد اگر طلبہ کو محض امتحان پاس کروانے اور نوکری کے قابل بنانے کے لیے پڑھائے تو وہ علم کو تجارت کا آلہ بنا رہا ہے، لیکن اگر وہ طلبہ کے دل و دماغ میں شعور، اخلاق اور خدمت کا جذبہ پیدا کرے تو وہ علم کی حقیقی روح کو زندہ کر رہا ہے۔

قرآن نے واضح کیا ہے کہ علم کا اصل مقصد انسان کو بصیرت دینا اور اس کے دل کو نور سے منور کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم کو امانت کہا گیا ہے اور اس کی خیانت یہ ہے کہ اسے دنیاوی منافع اور ذاتی مفاد کے تابع کر دیا جائے۔ تعلیم

اگر انسان کو صرف ایک "کارآمد مزدور" یا "منافع کمانے والی مشین" بناتی ہے تو وہ دراصل علم کو ظلمت میں بدل رہی ہے۔ لیکن اگر تعلیم انسان کو اپنی حقیقت پہچاننے، خدا کی معرفت حاصل کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو خدمتِ خلق کے لیے استعمال کرنے پر آمادہ کرے تو یہی علم دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا ذریعہ بنتا ہے۔

اسلامی تاریخ کے آئمہ اور حقیقی علما نے بارہا اس بات پر زور دیا کہ علم کی بنیاد نیت اور مقصد پر ہے۔ اگر نیت دنیا ہو تو علم اندھیرا ہے اور اگر نیت خدا اور انسانیت کی خدمت ہو تو علم نور ہے۔ لہٰذا جدید تعلیمی نظام میں بھی یہ تبدیلی لانی ہو گی کہ تعلیم کا مقصد صرف مارکیٹ اور کارپوریشنز نہ ہوں بلکہ انسان سازی اور اخلاقی ارتقا ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اساتذہ اور طلبہ دونوں علم کو الٰہی امانت سمجھیں اور اسے دنیاوی لالچ سے بلند رکھیں۔

یوں موجودہ دور کے اسکول اور یونیورسٹیاں بھی اس وقت تک اپنا حقیقی کردار ادا نہیں کر سکتیں جب تک وہ علم کو تجارت اور مارکیٹ کی غلامی سے نکال کر اسے قربِ الٰہی، انسانی خدمت اور عدل کے قیام کا ذریعہ نہ بنائیں۔ علم کو امانت ماننے کا مطلب یہی ہے کہ ہر طالب علم، استاد اور عالم یہ سمجھے کہ وہ جس علم کے حامل ہیں، وہ دراصل خدا کی طرف سے ایک ودیعت ہے جسے دنیاوی

حرص کے لیے بیچنا سب سے بڑی خیانت ہے۔ جب علم کو اس نگاہ سے دیکھا جائے گا تو وہ بازار کی شے نہیں بلکہ نورِ خدا اور ذریعۂ نجات بنے گا۔

اگر ہم اوپر کی بحث کو اسلامی تعلیمی ماڈل کے تناظر میں ڈھالیں تو تصویر مزید واضح ہو جاتی ہے۔ موجودہ نظامِ تعلیم کا بنیادی ڈھانچہ "مارکیٹ ڈیمانڈ" پر کھڑا ہے، اس لیے اس کے نصاب، تدریس اور تربیت کا مقصد طلبہ کو ایسے ہنر سکھانا ہوتا ہے جن کے ذریعے وہ کارپوریٹ سسٹم کے ملازم یا سرمایہ دارانہ تجارت کے معاون بن سکیں۔ لیکن اسلامی ماڈل تعلیم کی بنیاد اس سوچ پر رکھتا ہے کہ علم انسان کو "عبد" اور "خلیفۃ اللہ" بنائے، نہ کہ صرف ایک "پروفیشنل" یا "مزدور"۔

اس مقصد کے لیے اسلامی تعلیمی ماڈل کی پہلی شرط یہ ہے کہ نصاب کو دو واضح سطحوں پر بنایا جائے: ایک سطح وہ جو دنیاوی مہارتوں اور سکلز پر مشتمل ہو تاکہ انسان زندگی کے ضروری وسائل حاصل کر سکے، اور دوسری سطح وہ جو عقیدہ، اخلاق، عبادت اور انسانی خدمت کے جذبے کو پروان چڑھائے۔ ان دونوں کو الگ الگ نہیں بلکہ مربوط رکھا جائے تاکہ جب ایک طالب علم ڈاکٹر، انجینئر، استاد یا بزنس مین بنے تو وہ اپنی مہارت کو اللہ کی امانت سمجھے اور اپنی پریکٹس یا کاروبار کو بندگیِ خدا کا حصہ سمجھے۔

اسکول میں بچوں کو صرف ریاضی اور سائنس نہیں بلکہ ان علوم کے ساتھ یہ شعور بھی دیا جائے کہ یہ سب خدا کی نشانیاں ہیں اور ان کا مقصد انسانیت کی خدمت ہے۔ یونیورسٹی میں جب بزنس پڑھایا جائے تو محض منافع بڑھانے کے طریقے نہ سکھائے جائیں بلکہ یہ بھی بتایا جائے کہ تجارت اگر عدل و امانت پر نہ ہو تو وہ خیانت ہے۔ میڈیکل کالج میں طلبہ کو صرف انسانی جسم کا علم نہ دیا جائے بلکہ یہ بھی بتایا جائے کہ مریض کا علاج کرنا ایک عبادت ہے اور اسے دنیاوی لالچ کے تابع کرنا علم کی خیانت ہے۔

اساتذہ کی تربیت بھی اسی فکر کے ساتھ ضروری ہے۔ ایک استاد اگر اپنے آپ کو "علم کا تاجر" سمجھے جو صرف فیس لے کر مضمون پڑھاتا ہے تو وہ اس امانت میں خیانت کر رہا ہے۔ لیکن اگر استاد یہ سمجھے کہ وہ طلبہ کے دل و دماغ میں نور اور بصیرت منتقل کر رہا ہے، تو وہی پڑھائی عبادت بن جاتی ہے۔ اس کے لیے اساتذہ کو قرآن، حدیث اور اسلامی فلسفۂ تعلیم سے واقف کرانا ناگزیر ہے تاکہ وہ اپنے ہر لیکچر اور نصاب کو الٰہی امانت کے طور پر برتیں۔

اسی طرح اسلامی ماڈل میں امتحان اور کامیابی کا معیار بھی بدلنا ہو گا۔ آج امتحان کا مطلب یہ ہے کہ طالب علم کتنی مارکیٹ ویلیو پیدا کر سکتا ہے، لیکن اسلامی معیار کے مطابق کامیابی یہ ہے کہ علم نے طالب علم کے دل کو کتنا پاکیزہ، اس

کے اخلاق کو کتنا بلند اور اس کے رویے کو کتنا انسان دوست بنایا۔ اگر ایک طالب علم اعلیٰ نمبر لے لیکن خدمتِ خلق اور عدل کے جذبے سے خالی ہو تو یہ حقیقی کامیابی نہیں بلکہ بوجھ ہے۔

یہی وہ تعلیمی ماڈل ہے جو ائمہ اہلبیتؑ نے دکھایا۔ امام علیؑ نے علم کو عدل کا ذریعہ بنایا، امام جعفر صادقؑ نے علومِ دینیہ اور سائنسی علوم دونوں کو خدا کی معرفت اور بندگی کے ساتھ جوڑا، اور امام حسینؑ نے یہ تعلیم دی کہ اگر علم ظلم کے خلاف کھڑا نہیں ہوتا تو وہ حقیقی علم نہیں۔ ان مثالوں کی روشنی میں اسلامی ماڈل تعلیم ہمیشہ اس سوال کے ساتھ نصاب تیار کرتا ہے کہ "یہ علم خدا کے قرب، خدمتِ خلق اور عدل کے قیام میں کیسے مددگار ہوگا؟"۔

یوں اسکول، کالج اور یونیورسٹی اگر اسلامی ماڈل اپنائیں تو وہ کارپوریٹ سسٹم کے ملازم نہیں بلکہ امام زمانہؑ کے حقیقی کارکن اور انسانِ کامل پیدا کریں گے۔ یہ ماڈل علم کو تجارت اور مارکیٹ کی غلامی سے نکال کر اس کی اصل حقیقت یعنی الٰہی امانت کے طور پر زندہ کرتا ہے

خود سے زیادہ خدا پر اعتماد رکھیں

انسانی زندگی میں سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کا سہارا کس کو سمجھتا ہے؟ اپنی کامیابی، ناکامی، خوشی، غم، علم اور اختیار کے مرکز کو کہاں رکھتا ہے؟ اگر انسان کا مرکز خود اس کی ذات بن جائے تو وہ ایک محدود دائرے میں قید ہو جاتا ہے۔ مگر جب وہ اپنے وجود اور اپنی کوششوں کو ایک اعلیٰ، لامحدود اور ہمہ دان ہستی کے سپرد کر دیتا ہے، تو اس کے اندر وہ وسعت پیدا ہوتی ہے جو سکون، یقین اور استقامت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

خدا پر اعتماد کرنا دراصل انسان کے اندرونی نظام کو توازن میں لانے کا ایک روحانی عمل ہے۔ یہ اعتماد انسان کو اس احساس سے نکالتا ہے کہ دنیا کے تمام بوجھ اس کے اپنے کندھوں پر ہیں۔ جب کوئی شخص خود سے زیادہ خدا پر بھروسہ رکھتا ہے تو وہ اپنے اندر سے خوف، بے یقینی، اضطراب اور ناکامی کے احساسات کو بتدریج کم کرتا ہے۔ نفسیاتی طور پر یہ طرزِ فکر انسان کو ایک مستقل اطمینان اور ذہنی سکون عطا کرتا ہے۔ جب وہ سمجھتا ہے کہ نتائج اس کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ایک حکیم، علیم اور عادل خالق کے اختیار میں ہیں، تو وہ اپنی کوشش کو خالص نیت سے انجام دیتا ہے، لیکن نتائج کے بارے میں بے

قراری اور پریشانی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہی نقطۂ توکل ہے ــــ یعنی عمل کرنا اپنی حد تک، مگر اعتماد رکھنا اس قوت پر جو انسان کی حد سے ماورا ہے۔ اس یقین سے انسان کے اندر خود اعتمادی بھی مضبوط ہوتی ہے، کیونکہ وہ خود کو ایک تنہا مخلوق نہیں بلکہ خدائی نظام کا حصہ سمجھتا ہے۔

سماجی سطح پر یہ طرزِ ایمان ایک مہذب، پُرامن اور باہمی تعاون پر مبنی معاشرہ تشکیل دیتا ہے۔ جو لوگ خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں، وہ دوسروں پر ظلم نہیں کرتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ طاقت اور اختیار کا اصل منبع وہ نہیں بلکہ خدا ہے۔ ایسے لوگ حسد، رقابت اور حرص کے دائرے سے نکل کر دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے والے بنتے ہیں۔ خدا پر اعتماد رکھنے والا انسان دوسروں کے لیے بھی امن کا ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ اس کے فیصلے ذاتی مفاد نہیں بلکہ خدا کی رضا سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یوں ایک فرد کا ایمان پورے معاشرے کی اخلاقی فضا کو متوازن کرتا ہے۔

اس حکمت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ انسان کو عاجزی اور خود فریبی کے درمیان توازن سکھاتی ہے۔ جو شخص اپنی صلاحیتوں پر فخر کرتا ہے مگر ساتھ یہ بھی مانتا ہے کہ انہی صلاحیتوں کی تخلیق اور بقا خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ کبھی تکبر میں مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی کامیابی کو فضلِ خدا سمجھتا ہے، اور اپنی ناکامی کو

اصلاح کا موقع۔ یہ طرزِ فکر انسان کو شکست سے ٹوٹنے نہیں دیتا، اور کامیابی سے بگڑنے نہیں دیتا۔

بالآخر، جب انسان خود سے زیادہ خدا پر اعتماد کرنا سیکھ لیتا ہے تو اس کی زندگی میں ایک گہرا سکون، ایک خاموش اطمینان، اور ایک مقصدی استقامت پیدا ہوتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے ہر کام، ہر منصوبے، ہر دعا اور ہر جدوجہد کے پیچھے ایک ایسی مشیت کار فرما ہے جو اسے اُس انجام تک پہنچائے گی جو اس کے حق میں بہتر ہے۔ یہی یقین، یہی بھروسہ، اور یہی سہارا انسان کو نہ صرف نفسیاتی اور سماجی اعتبار سے متوازن بناتا ہے بلکہ اسے ایک حقیقی مومن کے درجے تک پہنچاتا ہے، جو جانتا ہے کہ "ان اللہ مع الصابرین" — بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

زندگی میں بعض اوقات ایسے لمحات آتے ہیں جب انسان کے تمام منصوبے، تجربے، علم، وسائل اور تعلقات بے بس ہو جاتے ہیں۔ ان لمحوں میں عقل کہتی ہے کچھ نہیں ہو سکتا، دل کہتا ہے سب ختم ہو گیا، مگر ایمان کہتا ہے کہ ابھی سب کچھ باقی ہے کیونکہ خدا ابھی باقی ہے۔ یہی وہ گھڑیاں ہیں جب انسان کو خود سے زیادہ خدا پر اعتماد کرنا چاہیے۔

ایسا لمحہ اُس وقت آتا ہے جب انسان کسی شدید بیماری میں مبتلا ہو اور علاج، دعاؤں اور تدبیروں کے باوجود طبیعت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی جائے۔ اس موقع پر اگر انسان صرف اپنی یا ڈاکٹر کی صلاحیت پر تکیہ رکھے تو مایوسی اسے توڑ دیتی ہے، لیکن اگر وہ یقین کر لے کہ "وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ" — "جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے "(الشعراء:80)—تو اس کے اندر ایک روحانی قوت جاگتی ہے جو مرض کو بھی کمزور کر دیتی ہے۔

اسی طرح جب کوئی شخص اپنے شدید مالی بحران میں گھر جائے، ہر دروازہ بند دکھائی دے، ہر کوشش بے نتیجہ لگے، تب خدا پر بھروسہ ہی وہ ریڑھ کی ہڈی ہے جو انسان کو ٹوٹنے نہیں دیتی۔ یہی وہ کیفیت ہے جس میں قرآن کہتا ہے: "وَمَن يَتَّقِ اللهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا، وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" — "جو اللہ سے ڈرتا ہے، وہ اس کے لیے نکلنے کا راستہ پیدا کرتا ہے اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا "(الطلاق: 2-3)۔ اس آیت کا یقین انسان کے اندر وہ حوصلہ پیدا کرتا ہے جو خوفِ تنگدستی کو مٹا دیتا ہے۔

کبھی کبھی انسان اپنے کسی عزیز کو کھو دیتا ہے، یا زندگی کے خواب اچانک ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس لمحے دل چیخ اٹھتا ہے کہ اب کچھ باقی نہیں، لیکن وہی شخص جو

خدا پر اعتماد رکھتا ہے، جانتا ہے کہ نقصان کے بعد بھی زندگی کے معنی ختم نہیں ہوتے، کیونکہ خدا ہر زخم کے پیچھے حکمت اور ہر جدائی کے پیچھے تربیت رکھتا ہے۔ "إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" (الشرح 6:) " — بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہے — "کا یقین ہی اس کے اندر نئی زندگی پھونک دیتا ہے۔

ایک اور موقع وہ ہوتا ہے جب انسان حق کی راہ پر چلتے ہوئے تنہا پڑ جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ سچ بولنے کی قیمت ہے، انصاف کرنے کا نتیجہ دشمنی ہے، یا ایمان پر قائم رہنے کا مطلب معاشرتی تنہائی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عقل مصلحت کا مشورہ دیتی ہے مگر ایمان کہتا ہے: "إِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا" (الحج: 38) " — بے شک اللہ ان لوگوں کا دفاع کرتا ہے جو ایمان لائے"۔ یہی اعتماد انسان کو کمزور نہیں بلکہ مضبوط بناتا ہے، اور وہ تنہائی میں بھی طاقت محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا اس کے ساتھ ہے۔

کبھی انسان اپنی اولاد، اپنے مستقبل، یا اپنے خوابوں کے بارے میں خوف زدہ ہوتا ہے، اسے لگتا ہے کہ اگر میں نے سب کچھ نہیں سنبھالا تو سب بکھر جائے گا۔ لیکن جب وہ یہ سمجھتا ہے کہ محافظ وہ نہیں بلکہ "فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ" (یوسف: 64) " — اللہ بہترین محافظ ہے اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے — "تو اس کا دل ہلکا ہو جاتا ہے۔

یہ فلسفۂ زندگی — کہ انسان خود سے زیادہ خدا پر اعتماد رکھے —دراصل قرآن اور تعلیماتِ اہلِ بیت علیہم السلام کے روحانی اور اخلاقی نظام کی بنیاد ہے۔ قرآنِ مجید نے بارہا انسان کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرے، کیونکہ انسان کی قوت محدود ہے اور خدا کی قدرت لامحدود۔ اسی عقیدۂ توکل کے ذریعے انسان نفسیاتی سکون، اجتماعی توازن، اور روحانی کمال تک پہنچتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

"وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ"

(سورہ الطلاق، آیت 3)

"جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے، اللہ اس کے لیے کافی ہے۔"

یہ آیت دراصل ایمان کے اُس مقام کو ظاہر کرتی ہے جہاں انسان اپنی تدبیر کو انجام دیتا ہے مگر دل سے سمجھتا ہے کہ انجامِ کار خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جب انسان یہ یقین پالیتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے علم اور عدل کے تحت ہوتا ہے، تو اس کے اندر خوف، غم اور بے یقینی کے جذبات ختم ہونے لگتے ہیں۔

اسی طرح قرآنِ مجید ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

"إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ"

(سورہ آل عمران، آیت 159)

"بے شک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

یہ آیت نہ صرف ایک وعدہ ہے بلکہ ایک اطمینان بھی، کہ خدا اُن دلوں کو پسند کرتا ہے جو اُس پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اور یہ محبتِ الٰہی انسان کے دل میں وہ نفسیاتی سکون پیدا کرتی ہے جو کسی مادی سہارے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

اہلِ بیت علیہم السلام کی روایات میں بھی اس فلسفے کو کمال کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"التَّوَكُّلُ عَلَى اللهِ نَجَاةٌ مِنْ كُلِّ سُوءٍ، وَحِرْزٌ مِنْ كُلِّ عَدُوٍّ".

(غرر الحکم، ح ۱۷۹۴)

"اللہ پر بھروسہ ہر برائی سے نجات ہے اور ہر دشمن سے پناہ ہے۔"

یہ فرمان ہمیں بتاتا ہے کہ توکل کوئی محض نظری عقیدہ نہیں بلکہ ایک حقیقی نفسیاتی اور اخلاقی ڈھال ہے جو انسان کو خوف، مایوسی اور بیرونی خطرات سے محفوظ رکھتی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الغِنَى وَالْعِزُّ يَجُولَانِ، فَإِذَا ظَفِرَا بِمَوْضِعِ التَّوَكُّلِ أَوْطَنَا".

(تحف العقول)

"غنا (بے نیازی) اور عزت (وقار) زمین میں گھومتے ہیں، جب انہیں کسی دل میں توکل ملتا ہے تو وہ وہیں ٹھہر جاتے ہیں۔"

یعنی جو انسان خدا پر بھروسہ رکھتا ہے، اس کے دل میں خودداری، عزتِ نفس اور باطنی دولت پیدا ہو جاتی ہے — وہ لوگوں کے سامنے محتاج نہیں رہتا۔ یہ توکل اُس کو نفسیاتی طور پر استقلال اور خوداعتمادی دیتا ہے، جو دنیاوی خودپرستی سے بالکل مختلف ہے۔

قرآنِ کریم نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی یہی درس دیا:

"فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ"

(سورہ آل عمران، آیت 159)

"جب تم عزم کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔"

یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ عمل اور توکل لازم و ملزوم ہیں۔ انسان کو اپنے فرائض پورے کرنے چاہئیں، مگر نتیجے کی فکر میں بے چین نہیں ہونا چاہیے۔ یہی طرزِ فکر نفسیاتی اطمینان اور سماجی توازن کا سرچشمہ بنتا ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لو أنكم تتوكلون على الله حق توكله، لرزقكم كما يرزق الطير، تغدو خماصاً وتروح بطاناً".

(سنن الترمذی، ح ۲۳۴۴)

"اگر تم اللہ پر حقیقی توکل کرو، تو وہ تمہیں اسی طرح رزق دے گا جیسے پرندوں کو دیتا ہے، جو صبح بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر لوٹتے ہیں۔"

یہ مثال انسان کو سکھاتی ہے کہ توکل کا مطلب ہاتھ پر ہاتھ رکھنا نہیں بلکہ اعتماد کے ساتھ عمل کرنا ہے۔ جیسے پرندہ پرواز کرتا ہے، رزق کی تلاش میں نکلتا ہے مگر یقین رکھتا ہے کہ روزی دینے والا خدا ہے۔

نتیجہ کے طور پر، یہ فلسفۂ زندگی انسان کو مادی اضطراب، روحانی غفلت، اور معاشرتی خودغرضی سے نکال کر ایک ایسی متوازن حالت میں لے آتا ہے جہاں دل مطمئن، عمل بامقصد، اور زندگی معنویت سے بھرپور ہو جاتی ہے۔ خدا پر اعتماد کا یہ راستہ وہی ہے جو قرآن نے "إِلَى اللّٰهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ" (الحدید:5) کے الفاظ میں بیان کیا — یعنی آخرِکار تمام امور خدا کی طرف لوٹتے ہیں۔

اسی تناظر میں جنہوں نے خدا پر بھروسہ کرنے کے بجائے غیر خدا پر اعتماد کیا، قرآنِ کریم میں بارہا ان قوموں اور افراد کی مثالیں دی گئی ہیں، اپنی طاقت،

مال، سیاست، یا علم پر ناز کیا، اور نتیجتاً ہلاکت و ذلت کا سامنا کیا۔ سب سے نمایاں مثال فرعون کی ہے، جس نے اپنے اقتدار اور دولت کو نجات کا ذریعہ سمجھا۔ اس نے کہا" :أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ۔وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي "(الزخرف: 51)، یعنی کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں اور یہ نہریں میرے زیرِ حکم نہیں بہہ رہیں؟ اس تکبر اور خوداعتمادی نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا کہ وہ خود کو ربِ اعلیٰ کہنے لگا۔ مگر جب خدا کا عذاب آیا تو وہی سمندر جو اس کے اقتدار کی علامت تھا، اس کی موت کا سبب بن گیا۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ غیر خدا پر بھروسہ انسان کو وقتی قوت تو دیتا ہے مگر انجام میں فنا کی طرف لے جاتا ہے۔

اسی طرح قارون کی مثال بھی اسی سنتِ الٰہی کا مظہر ہے۔ قارون کو اپنی دولت اور علم پر غرور تھا۔ وہ کہتا تھا" :إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي "(القصص: 78)، یعنی مجھے یہ سب میرے علم کی وجہ سے ملا ہے۔ اس نے خدا کے نظامِ رزق کو بھلا دیا اور دولت کو اپنی محنت کا ثمر سمجھا۔ جب زمین نے اسے نگل لیا تو وہی لوگ جو کل تک اس کی چمک دمک سے مرعوب تھے، آج عبرت لینے لگے۔ قارون کا انجام یہ بتاتا ہے کہ جو شخص اپنے وسائل پر بھروسہ کرتا ہے

اور انہیں خدا کی نعمت کے بجائے اپنی خودی کا نتیجہ سمجھتا ہے، وہ آخرکار انہی وسائل کے بوجھ تلے دب جاتا ہے۔

قومِ عاد اور قومِ ثمود بھی اسی غرور کی مثال ہیں۔ عاد نے اپنی جسمانی قوت اور بلند عمارتوں پر ناز کیا۔ قرآن کہتا ہے" :وَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً "(فصلت: 15)، یعنی انہوں نے زمین میں تکبر کیا اور کہا ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ مگر جب ایک زبردست ہوا کا طوفان آیا تو ان کی قوت مٹی کے ذروں کی طرح بکھر گئی۔ ثمود نے اپنی صنعت و مہارت پر بھروسہ کیا، چٹانوں میں گھر تراشے اور سمجھا کہ اب کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، لیکن ایک چیخ نے ان کی بستیوں کو نیست و نابود کر دیا۔

تاریخ کے اوراق میں نمرود کی مثال بھی نمایاں ہے۔ وہ آتش پرست بادشاہ جس نے اپنی فوج، سلطنت اور اسلحے پر بھروسہ کیا، مگر خدا نے ایک معمولی مچھر کے ذریعے اس کی جان لے لی۔ اس کا انجام یہ واضح کرتا ہے کہ جب انسان خدا کے سہارے کے بجائے اپنے محدود ذرائع پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ خود اپنے زوال کا سامان تیار کرتا ہے۔

قرآن میں بنی اسرائیل کے واقعات بھی اسی اصول کو بیان کرتے ہیں۔ جب وہ خدا کے حکم پر جہاد سے پیچھے ہٹے اور کہا کہ "اے موسیٰ! تم اور تمہارا رب

جاؤ اور لڑو، ہم یہیں بیٹھے ہیں"، تو وہ چالیس سال تک تیہ کے صحرا میں بھٹکتے رہے۔ ان کا یہ بھٹکنا دراصل خدا سے بے اعتمادی اور غیر خدا پر تکیہ کرنے کی سزا تھی۔

یہ تمام واقعات ایک ہی سنتِ الٰہی کو ظاہر کرتے ہیں کہ جو خدا کو چھوڑ کر کسی اور قوت پر اعتماد کرتا ہے، وہ گویا اپنی بنیاد ریت پر رکھتا ہے۔ وہ لمحاتی طور پر بلند عمارت کھڑی کر لیتا ہے مگر طوفانِ تقدیر کے ایک جھونکے سے وہ سب بکھر جاتا ہے۔ اور اس کے برعکس، جو خدا پر توکل کرتا ہے، چاہے وسائل کم ہوں، وہ ثابت قدم رہتا ہے کیونکہ اس کا سہارا ازلی اور ابدی ہے۔ یہی وہ فرق ہے جو فرعون اور موسیٰؑ، قارون اور ایوبؑ، اور نمرود اور ابراہیمؑ کے درمیان تھا۔ پہلے گروہ نے خود پر بھروسہ کیا اور فنا ہو گئے، جب کہ دوسرے گروہ نے خدا پر بھروسہ کیا اور تاریخ میں ابدی عزت پائی۔

لہٰذا جو شخص خود سے زیادہ خدا پر بھروسہ رکھتا ہے، وہ دراصل اپنی حقیقت کو پہچان لیتا ہے؛ وہ اپنے ارادے کو مشیتِ الٰہی کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ ان تمام مواقع پر جب انسان کے اپنے وسائل ختم ہو جاتے ہیں دراصل انسان کے امتحان نہیں بلکہ ایمان کے مواقع ہیں۔ تب خدا چاہتا ہے کہ وہ اپنے حقیقی سہارا دینے والے کو پہچانے۔ خود پر بھروسہ کرنا تدبیر ہے، مگر خدا پر اعتماد کرنا

یقین ہے۔ تدبیر انسان کو چلنا سکھاتی ہے، یقین اسے گر کر بھی اٹھنا سکھاتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ایمان کی روشنی انسان کی زندگی میں طلوع ہوتی ہے — جب وہ کہتا ہے "حسبی اللہ لا إله إلا هو، علیه توکلت، وهو رب العرش العظیم" — "اللہ میرے لیے کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے توکل کیا، اور وہ عرشِ عظیم کا رب ہے۔" یہی یقین، یہی توکل، اور یہی بھروسہ انسان کو روحانی آزادی، نفسیاتی سکون، اور سماجی استحکام عطا کرتا ہے — اور یہی قرآن و اہلِ بیت علیہم السلام کا اصل پیغام ہے۔

والدین کے آپسی اور بچوں سے تعلقات کے صحت پر اثرات

والدین کے باہمی تعلقات بچوں کی نفسیاتی اور جسمانی صحت کی بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ بچہ دنیا کو براہِ راست نہیں سمجھتا، وہ سب سے پہلے اپنے گھر کی فضا کو محسوس کرتا ہے اور اسی کے ذریعے یہ سیکھتا ہے کہ انسان ہونا کیا ہے، محبت کی نوعیت کیا ہے، تنازع کو کیسے برتنا ہے، خوف اور تحفظ کا مفہوم کیا ہے اور خود اس کی ذات کی قدر کتنی ہے۔ والدین کا رشتہ اگر سکون، باہمی احترام، گفت و شنید اور نرم روی پر قائم ہو تو بچے کے اندر ایک بنیادی تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے جو اس کے اعصابی نظم، ہارمونل توازن، جذباتی خود اعتمادی اور سماجی رویّے کو مضبوط بناتا ہے۔ ایسے گھر میں پروان چڑھنے والا بچہ اپنے جسم کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ رہتا ہے، اس کی نیند بہتر ہوتی ہے، خوراک منظم رہتی ہے، بیماریوں کے خلاف مزاحمت مضبوط بنتی ہے اور ذہن میں غیر ضروری تناؤ کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس والدین کا تناؤ بھرا، جھگڑالو یا مسلسل ٹھنڈا تعلق بچوں کے ذہنی وجود پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ والدین کی بلند آوازیں، الزام تراشی، خاموش

لڑائیاں، بے رخی یا ایک دوسرے سے جذباتی لاتعلقی بچے کے اعصابی نظام کو دائمی خطرے کی حالت میں لے آتی ہے۔ بچے کا دماغ خطرے کی بو بہت تیزی سے سونگھتا ہے، چاہے الفاظ نرم ہوں مگر والدین کے درمیان نفرت، جبر یا بے اعتمادی کا پردہ بچے کے احساس تک ضرور پہنچتا ہے۔ اس کیفیت میں اس کے جسم میں کارٹیسول اور ایڈرینالین جیسے سٹریس ہارمون مسلسل بلند رہتے ہیں، جس سے دل کی دھڑکن بے ترتیبی کا شکار ہوتی ہے، معدہ حساس ہو جاتا ہے، سر درد اور جسمانی درد بڑھ جاتے ہیں، نیند ٹوٹتی رہتی ہے اور توجہ بکھر جاتی ہے۔ یہی کیفیت اگر برسوں جاری رہے تو بچے کی شخصیت میں دفاعی پن، غصہ، چڑچڑاہٹ, کم اعتمادی اور خوف کے مستقل زاویے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جب والدین کے تعلقات میں مسلسل جھگڑا روزمرہ کا حصہ بن جائے تو بچہ ہر وقت چوکنّا رہنا سیکھ لیتا ہے۔ اس کی ذہنی توانائی کا بڑا حصہ اس بات پر صرف ہونے لگتا ہے کہ گھر کا ماحول کب پھٹ جائے گا۔ یہ دائمی تھکن اور ذہنی بوجھ جسمانی مدافعتی نظام کو کمزور کر دیتا ہے، جس سے بچے زیادہ بار بیمار ہوتے ہیں، چھوٹے انفیکشن دیر تک رہتے ہیں اور بڑھتے ہوئے جسم کے لیے ضروری ہارمونز میں بے ترتیبی پیدا ہوتی ہے۔ اسکول میں کارکردگی متاثر ہونے لگتی ہے، دوستیوں میں اعتماد کم ہو جاتا ہے اور بچہ یا تو حد سے زیادہ خاموش اور الگ

تھلگ ہو جاتا ہے یا غیر معمولی ضد اور غصے کے ساتھ رویّے ظاہر کرتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں دراصل گھر کے نامتوازن ماحول کا نفسیاتی عکس ہوتی ہیں۔

اسی طرح والدین کا جذباتی طور پر ٹھنڈا رشتہ بھی بچے کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گھر میں جھگڑے نہیں ہوتے مگر محبت، احترام، قربت اور باہمی گرمی بھی نہیں ہوتی۔ والدین ایک دوسرے سے الگ رویّے، بے رخی یا رسمی تعلق کے ساتھ رہ رہے ہوتے ہیں۔ بچہ ایسی فضا میں اظہارِ محبت، جذباتی وابستگی اور تعلق کے بنیادی رموز سے ناواقف رہ جاتا ہے۔ وہ دوسروں کی گرمجوشی سے گھبرا جاتا ہے یا اسے سمجھ نہیں پاتا۔ اس کی شخصیت میں خالی پن، تنہائی اور تعلقات سے خوف پیدا ہونے لگتا ہے۔ جسمانی طور پر ایسے بچے اکثر نیند کی بے ترتیبی، معدے کے درد، بھوک میں کمی یا بے چینی جیسے مسائل میں مبتلا رہتے ہیں کیونکہ ان کے دماغ کو وہ داخلی اطمینان میسر نہیں ہوتا جو جسم کو منظم رکھتا ہے۔

اگر والدین کے تعلقات میں ایک فریق دوسروں پر روحانی، جذباتی یا جسمانی جبر کرتا ہو تو بچے کی دنیا مزید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے دل میں دو مختلف نقوش لے کر بڑا ہوتا ہے: ایک محبت کا اور ایک خوف کا۔ ایسے گھر میں بچہ ظاہری طور پر مضبوط دکھائی دے سکتا ہے مگر اندر سے اس کے ہونے

میں دراڑیں پڑ چکی ہوتی ہیں۔ وہ یا تو اس جبر کو اپنی شخصیت کا حصہ بنالیتا ہے اور دوسروں پر سختی دکھانے لگتا ہے یا مکمل طور پر خوف زدہ، دفاعی اور خود سے بے یقین ہو جاتا ہے۔ جسمانی سطح پر ایسے بچوں میں دائمی درد، جلدی بیمار پڑ جانا، الرجیز، بلڈ پریشر کی کم یا زیادہ تبدیلی اور حتیٰ کہ بڑے ہو کر دل اور ذہنی امراض کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

والدین کا صحت مند تعلق بچے کے اندر ایک بنیادی پیغام چھوڑتا ہے کہ دنیا قابلِ اعتماد ہے، محبت سچی ہے، اختلاف محفوظ ہے اور انسان سیکھ کر بہتر ہو سکتا ہے۔ جبکہ والدین کے بیمار تعلقات یہ پیغام دیتے ہیں کہ دنیا غیر محفوظ ہے، لوگ دھوکہ دے سکتے ہیں، جذبات خطرناک ہیں اور محبت تکلیف دیتی ہے۔ یہ دونوں پیغام جسمانی صحت، ذہنی سکون، جذباتی توازن اور شخصیت کی تعمیر کو عمر بھر کے لیے متاثر کرتے ہیں۔ بچے زندگی کے بیشتر فیصلے انہی اولین نقوش کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ اس لیے والدین کا باہمی تعلق محض ذاتی یا ازدواجی مسئلہ نہیں بلکہ بچے کی پوری طبی اور نفسیاتی زندگی کا محور ہے۔ بچے کا دل والدین کے درمیان پائے جانے والے سکون یا انتشار کی آواز سن کر ہی دھڑکنا سیکھتا ہے، اور یہی وہ دھڑکن ہے جو بعد کی پوری زندگی کا سمت نامہ بن جاتی ہے۔

والدین کے آپس کے تعلق کی نوعیت صرف ان کے ذاتی رشتے تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہی کیفیت آگے بڑھ کر والدین اور بچوں کے تعلق کی بنیاد بھی بن جاتی ہے۔ اگر میاں بیوی کے درمیان باہمی احترام، محبت، اعتماد اور گفتگو کی صحت مند روایت قائم ہو تو وہی اعتدال خود بخود بچوں کی پرورش کے انداز میں منتقل ہوتا ہے۔ والدین کے دلوں کی ہم آہنگی بچے کے دل میں سکون کی پہلی اینٹ رکھتی ہے، اور یہی فضا انہیں تربیت دینے کے انداز، حدود مقرر کرنے کے طریقے اور محبت کے اظہار میں توازن پیدا کرتی ہے۔ لیکن اگر والدین ایک دوسرے کے ساتھ تناؤ، بے اعتمادی یا جذباتی لاتعلقی کا شکار ہوں تو یہی اضطراب ان کے والدینی رویوں میں سرایت کرتا ہے۔ پھر نہ محبت اپنی فطری گرمی میں رہ پاتی ہے اور نہ حدود اپنی حکمت کے ساتھ قائم رہتی ہیں۔ یوں بچے تک پہنچنے والا تعلق کبھی افراط کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور کبھی تفریط کی، اور یہی والدین کے باہمی تعلق کا اصل عکس ہوتا ہے۔

اسی لیے والدین کے خود باہم توازن میں رہنا، ایک دوسرے کے ساتھ صحت مند، احترام پر مبنی اور باہمی تعاون والا رشتہ قائم رکھنا وہ بنیاد ہے جس پر بچوں کے ساتھ اعتدال پر مبنی تعلق تعمیر ہوتا ہے۔ والدین کی ازدواجی فضا ہی وہ

اصل سرچشمہ ہے جس سے بچے کے ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی مستقبل کے تمام راستے پھوٹتے ہیں۔

والدین اور بچوں کے درمیان تعلق دراصل بچے کی پوری زندگی کی داخلی فضا تشکیل دیتا ہے۔ یہ تعلق اگر اعتدال پر قائم ہو تو بچے کے ذہنی، جذباتی، جسمانی اور روحانی ہر دائرے میں توازن، اطمینان اور نشوونما کی بنیاد رکھتا ہے، لیکن اگر اسی تعلق میں افراط یا تفریط آجائے تو صحت کے مختلف پہلو آہستہ آہستہ زوال پذیر ہونے لگتے ہیں۔ اعتدال کا تعلق وہ ہے جس میں والدین محبت دیتے ہیں مگر آزادی بھی دیتے ہیں، حدود مقرر کرتے ہیں مگر سخت گیری کا جبر مسلط نہیں کرتے، رہنمائی کرتے ہیں مگر بچے کی شخصیت کو اپنی مرضی سے تشکیل دینے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایسا تعلق بچے کے اندر اعتماد، تحفظ اور ذہنی سکون پیدا کرتا ہے۔ بچہ خود کو قابلِ احترام محسوس کرتا ہے، اس کی سوچ کھلتی ہے، نیند بہتر ہوتی ہے، ہارمونز متوازن رہتے ہیں اور سٹریس ہارمون جیسے کارٹیسول غیر ضروری حد تک نہیں بڑھتے۔ یہی انسان کو بعد کی زندگی کے ڈپریشن، اینگزائٹی اور نفسیاتی عدم استحکام سے بچانے کا سب سے بنیادی محافظ بن جاتا ہے۔ اعتدال ہی وہ فضا پیدا کرتا ہے جس میں بچے کا

مدافعتی نظام طاقتور رہتا ہے اور وہ جسمانی بیماریوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

اس کے مقابل، والدین کی طرف سے حد سے زیادہ محبت، بے جا نرمی، ضرورت سے زیادہ تحفظ اور بچوں کو ہر مشکل سے بچانے کی کوشش افراطی تعلق پیدا کرتی ہے۔ بظاہر یہ محبت کا اظہار لگتا ہے مگر حقیقت میں بچے کی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں پروان چڑھنے والا بچہ باہر کی دنیا کے حقیقی چیلنجز سے ناواقف رہتا ہے۔ اس کی دماغی نشوونما میں وہ صلاحیتیں کمزور پڑنے لگتی ہیں جو خطرات، ناکامیوں اور دباؤ کو جذب کرکے سیکھنے کا راستہ کھولتی ہیں۔ نتیجتاً معمولی رکاوٹیں بھی اسے شدید ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ اینگزائٹی ڈس آرڈرز کی جڑیں عموماً ایسی ہی پرورش سے مضبوط ہوتی ہیں جس میں والدین ہر قدم پر بچے کی جگہ فیصلے کرتے ہیں۔ اس ماحول میں رہنے والے بچوں میں دل کی دھڑکن کے بے ترتیبی، معدے کے مسائل، ہارمونل عدم توازن اور نیند کی خرابی جیسے مسائل عام دیکھے گئے ہیں۔ چونکہ بچہ چھوٹی عمر سے ہی "محفوظ بلبلے" میں رہتا ہے اس لیے حقیقی زندگی کی پیچیدگیوں سے ٹکرانے پر اس کا اعصابی نظام شدید دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔

تفریطی تعلق یعنی وہ والدین جو بچوں کی طرف توجہ، محبت، رہنمائی یا جذباتی موجودگی میں کوتاہی کرتے ہیں، صحت کے لیے کہیں زیادہ سنگین مسائل پیدا کرتے ہیں۔ ایسے بچوں میں سب سے پہلے اعتماد کی جڑیں کمزور پڑتی ہیں۔ عدم توجہ اور غیر موجودگی دماغ میں ایسے کیمیائی پیغامات پیدا کرتی ہے جو خود کو ناقابلِ محبت یا کمتر سمجھنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ یہ کیفیت بعد میں مزاجی اضطراب، شدید اینگزائٹی، ڈپریشن، سماجی خوف اور خود سے نفرت تک لے جا سکتی ہے۔ جسمانی صحت پر بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ مسلسل جذباتی تنہائی اور والدین سے محرومی کارٹیسول کی سطح مستقل بلند رکھتی ہے جس سے جسم کا مدافعتی نظام کمزور ہونے لگتا ہے، دل کے امراض، شوگر، ہائی بلڈ پریشر اور معدے کی تیزابیت جیسے مسائل بڑھنے لگتے ہیں۔ ایسے بچے اکثر نیند کے مسائل، رات کو ڈراؤنے خواب، کھانے کے بے ترتیبی اور بار بار بیمار پڑنے کی شکایت میں مبتلا رہتے ہیں۔ شدید صورتوں میں یہ محرومی جسمانی درد کے احساس کو بھی بڑھا دیتی ہے کیونکہ دماغ ایسے سگنلز کو زیادہ شدت سے وصول کرنے لگتا ہے۔

بالآخر والدین اور بچوں کا تعلق صرف جذباتی یا اخلاقی مسئلہ نہیں بلکہ ایک طبی، نفسیاتی اور حیاتیاتی حقیقت بھی ہے۔ گھر کی فضا بچے کے دماغی سرکٹ کو تشکیل

دیتی ہے، اس کے ہارمونز کو منظم یا غیر منظم کرتی ہے، اس کی نیند، دل کی دھڑکن، معدے کے کام اور مدافعتی نظام تک کو براہِ راست متاثر کرتی ہے۔ اعتدال صحت کا محور ہے اور افراط و تفریط بیماریوں کے راستے کھولتے ہیں۔ اعتدال ہی وہ روحانی فضا بھی پیدا کرتا ہے جس میں بچے اللہ کی دی ہوئی فطری ساخت کے مطابق توازن، شکر، تحمل اور فرض شناسی کے ساتھ بڑھتے ہیں۔ انسان کی پوری زندگی دراصل ابتدائی تعلقات کی صحت کا عکس بن جاتی ہے، اور والدین کے رویے وہ پہلی ہوا ہے جس میں یہ پودا اُگتا ہے۔ اگر ہوا سازگار، متوازن اور نرم ہو تو درخت تناور اور مضبوط بنتا ہے، مگر اگر ہوا کبھی بہت تیز اور کبھی بالکل غائب ہو تو پودا یا تو جھک جاتا ہے یا سوکھنے لگتا ہے۔ یہی تعلقات کی سچائی ہے جس کا سب سے گہرا اثر انسان کی صحت پر پڑتا ہے۔

اسکرین کی تیزی، انسان کی آزمائش

یہ کہنا کہ ٹیکنالوجی آج وقت کی ضرورت ہے، تقاضہ ہے، محض ٹیکنالوجی کے فائدے اور نقصان کی بات نہیں بلکہ انسان کی ذہنی ساخت، اخلاقی سمت اور تہذیبی بقا کا سوال ہے۔ یہ کہہ دینا کہ "یہ وقت کا تقاضہ ہے" بظاہر حقیقت پسندانہ لگتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک فکری پسپائی ہے۔ ہر دور کے تقاضے ہوتے ہیں، مگر ہر تقاضہ قدرتی نہیں ہوتا، اور نہ ہی ہر تبدیلی انسان دوست ہوتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سی چیزیں اپنے زمانے میں "نیچرل پروگریس" کہلائیں، مگر بعد میں انسانیت کے لیے تباہ کن ثابت ہوئیں۔

سب سے پہلے اس کے حقیقی اثرات کو سمجھنا ضروری ہے۔

ڈیجیٹل ریلِز، شارٹس، تیز گیمز اور مسلسل اسکرین شفٹنگ بچوں کے دماغ میں توجہ (Attention) کے نظام کو بنیادی سطح پر متاثر کر رہی ہیں۔ بچے کا ذہن فطری طور پر سیکھنے کے لیے بنایا گیا ہے، مگر یہ سیکھنا تسلسل، تکرار اور تدریج مانگتا ہے۔ جب بچہ چند سیکنڈ بعد نئی ویڈیو، نیا رنگ، نیا شور دیکھتا ہے تو اس کا دماغ آہستہ آہستہ "گہرے فوکس" کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسکول کا سبق بوجھ لگتا ہے، استاد کی بات ادھوری سنائی دیتی ہے، اور ذرا سی

مشکل پر بچہ بد دل یا چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ یہ محض ضد یا بد تمیزی نہیں ہوتی بلکہ ایک تربیت یافتہ بے صبری ہوتی ہے۔

جذباتی سطح پر بچے فوری خوشی کے عادی ہو جاتے ہیں، اس لیے حقیقی زندگی کی سادہ خوشیاں انہیں پھیکی لگنے لگتی ہیں۔ ماں باپ کی توجہ، دوست کی صحبت، یا کھیل کے میدان کی مشقت اب وہ لذت نہیں دے پاتی جو اسکرین کا فوری رنگ و روشنی دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ اندرونی خالی پن، اکتاہٹ اور بعض اوقات کم عمری میں اضطراب اور اداسی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اب اگر بڑوں کی طرف آئیں تو اثرات کم نہیں بلکہ زیادہ پیچیدہ ہیں۔ بالغ انسان بظاہر کام کرتا رہتا ہے، ذمہ داریاں نبھاتا ہے، مگر اندر سے اس کی ذہنی ساخت ٹکڑوں میں بٹتی چلی جاتی ہے۔ ایک ہی وقت میں کئی ایپس، کئی خیالات اور کئی ردعمل ذہن میں چل رہے ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گہرے فیصلے مشکل ہو جاتے ہیں، گفتگو سطحی ہو جاتی ہے، اور برداشت کی حد کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ذرا سی اختلافی بات پر غصہ، جلد اکتاہٹ، اور تعلقات میں عدم تحمل اسی ذہنی انتشار کی علامات ہیں۔

اب اصل سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب "قدرتی عمل" ہے؟

اس کا جواب واضح ہے: نہیں۔

یہ فطرت کا ارتقا نہیں بلکہ ڈیزائن کیا گیا رویہ ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز انسان کے فائدے کے لیے نہیں بلکہ اس کی توجہ، وقت اور نفسیات کو زیادہ سے زیادہ قابو میں رکھنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اگر کوئی چیز انسان کی کمزوری کو استعمال کر کے اسے زیادہ محتاج بنائے تو وہ قدرتی نہیں بلکہ استحصالی عمل کہلاتا ہے۔ جس طرح نشہ آور اشیاء کو یہ کہہ کر جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ "یہ بھی دور کا تقاضہ ہیں"، اسی طرح ذہنی اور اعصابی لت کو بھی معمول نہیں کہا جا سکتا۔

یہ بھی درست نہیں کہ چونکہ سب یہی کر رہے ہیں اس لیے اس پر بات کرنا بے فائدہ ہے۔ تاریخ میں ہر اصلاحی تحریک اقلیت سے ہی شروع ہوئی ہے۔ مسئلہ تب بنتا ہے جب معاشرہ کسی خرابی کو اس لیے قبول کر لے کہ وہ عام ہو چکی ہے۔ یہ قبولیت دراصل اجتماعی بے حسی ہوتی ہے، نہ کہ دانائی۔

اسلامی اور انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو انسان کو "غافل" بنانا سب سے بڑا نقصان ہے۔ ایسا انسان جو ٹھہر کر سوچ نہ سکے، اپنے عمل کے نتائج پر غور نہ کر سکے، اور اپنی خواہشات کو کنٹرول نہ کر سکے، وہ بآسانی قابو میں آ جاتا ہے۔ چاہے وہ صارف کے طور پر ہو، ووٹر کے طور پر ہو، یا محض ایک خاموش

تماشائی کے طور پر۔ اس لیے یہ مسئلہ محض بچوں کی تربیت یا اسکرین ٹائم کا نہیں بلکہ انسان کی خود مختاری کا مسئلہ ہے۔

لٰہذا اس رجحان کو نہ تو فطری کہہ کر چھوڑ دینا چاہیے اور نہ ہی محض وقتی شور سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہیے۔ اسے ایک سنگین تہذیبی اور نفسیاتی مسئلہ سمجھنا ہو گا۔ فرق صرف یہ ہے کہ حل جذباتی مخالفت میں نہیں بلکہ شعوری نظم و ضبط میں ہے۔ ٹیکنالوجی کو رد نہیں کرنا، مگر اس کو انسان کے تابع بنانا۔ رفتار کو کم کرنا، گہرائی کو ترجیح دینا، اور بچوں اور بڑوں دونوں کو یہ سکھانا کہ ہر لذت فوری نہیں ہوتی، اور ہر قیمتی چیز صبر مانگتی ہے۔

لہذا یہ وقت کا تقاضہ نہیں بلکہ وقت کی آزمائش ہے۔ اور آزمائش میں وہی قومیں سرخرو ہوتی ہیں جو ہر تبدیلی کو عقل، اخلاق اور انسانیت کے میزان پر پرکھنے کی جرأت رکھتی ہیں۔

یہ بات اب محض اخلاقی وعظ یا ثقافتی شکوہ نہیں رہی بلکہ نیوروسائنس، نفسیات اور تعلیمی تحقیق کی سطح پر ایک تسلیم شدہ حقیقت بنتی جا رہی ہے کہ فیس بک ریلز، یوٹیوب شارٹس، تیز رفتار موبائل گیمز اور مسلسل نوٹیفکیشنز پر مبنی ایپس انسانی ذہن کو ایک خاص قسم کی جلد بازی، بے قراری اور لمحاتی لذت کے اسیر بنا دیتی ہیں۔ اس کیفیت کو سادہ الفاظ میں "ذہنی شفٹنگ کی لت" کہا جا سکتا

ہے، یعنی ذہن کا چند سیکنڈ سے زیادہ کسی ایک نکتے، خیال یا کام پر ٹھہر نہ پانا۔ اس کا سب سے گہرا اثر بچوں میں پڑتا ہے، لیکن بالغ بھی اس سے محفوظ نہیں۔ ان پلیٹ فارمز کا بنیادی ڈیزائن ڈوپامائن کے فوری اخراج پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر نئی ویڈیو، ہر نیا لیول، ہر لائک یا اسکور دماغ میں ایک چھوٹی سی خوشی کی لہر پیدا کرتا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ ڈوپامائن بری چیز ہے، مسئلہ یہ ہے کہ جب دماغ بار بار اور غیر فطری رفتار سے اس کی خوراک لینے لگتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ قدرتی، گہری اور دیرپا خوشیوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کتاب پڑھنا بور لگنے لگتا ہے، نماز یا دعا میں دل نہیں ٹھہرتا، گفتگو میں گہرائی ختم ہو جاتی ہے، اور کسی مشکل کام میں صبر کے ساتھ لگے رہنا اذیت محسوس ہونے لگتا ہے۔

تحمل اور صبر دراصل کوئی مجرد اخلاقی صفات نہیں بلکہ اعصابی نظام کی باقاعدہ تربیت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ انسانی دماغ فطری طور پر اس قابل ہے کہ وہ توجہ کو طویل عرصے تک برقرار رکھ سکے، لیکن یہ صلاحیت استعمال نہ ہونے سے کمزور پڑ جاتی ہے۔ جس طرح مسلسل نرم خوراک کھانے سے دانت کمزور ہو جاتے ہیں، اسی طرح مسلسل تیز اور فوری لذت لینے سے ذہن کی برداشت کم ہو جاتی ہے۔

ڈوپامائن کے متبادل کا مطلب یہ نہیں کہ خوشی ختم کر دی جائے، بلکہ یہ ہے کہ خوشی کے ذرائع کی نوعیت بدلی جائے۔ قدرتی ڈوپامائن آہستہ آہستہ، محنت کے بعد، اور معنی خیز سرگرمیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ جسمانی مشقت، تخلیقی کام، سیکھنے کا عمل، سماجی خدمت، اور روحانی عبادات سب ایسے ذرائع ہیں جو فوری جھٹکے کے بجائے گہری اور پائیدار تسکین پیدا کرتے ہیں۔ فرق صرف رفتار اور گہرائی کا ہے۔ ایک شارٹ ویڈیو چند سیکنڈ میں خوشی دیتی ہے اور چند سیکنڈ میں ختم ہو جاتی ہے، جبکہ کوئی ہنر سیکھنا یا کسی کی مدد کرنا آہستہ آہستہ ایسی خوشی دیتا ہے جو دیر تک دل میں ٹھہرتی ہے۔

ڈوپامائن کے صحت مند متبادل کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انسانی دماغ خوشی کو صرف ایک کیمیکل کے طور پر نہیں بلکہ ایک عمل (process) کے طور پر محسوس کرتا ہے۔ فوری ڈیجیٹل لذت دماغ کو یہ سکھاتی ہے کہ خوشی بغیر محنت، بغیر انتظار اور بغیر مقصد کے مل سکتی ہے، جبکہ فطری نفسیاتی نظام اس کے بالکل برعکس کام کرتا ہے۔ قدرتی خوشی کا تعلق کوشش، تسلسل، معنی اور تعلق سے ہوتا ہے۔ جب ہم متبادل ایکٹیویٹیز کی بات کرتے ہیں تو دراصل ہم دماغ کو دوبارہ اس فطری راستے پر لانے کی کوشش کرتے ہیں جہاں خوشی ''ملتی'' نہیں بلکہ ''بنتی'' ہے۔

جسمانی مشقت کو اگر نفسیاتی زاویے سے دیکھا جائے تو یہ محض جسم تھکانے کا عمل نہیں بلکہ دماغ کے اجر (reward) نظام کی گہری تنظیم نو ہوتی ہے۔ جب کوئی بچہ یا بالغ جسمانی محنت کرتا ہے، چاہے وہ کھیل ہو، چہل قدمی ہو یا کوئی باقاعدہ ورزش، تو دماغ میں ڈوپامائن کے ساتھ ساتھ سیروٹونن اور اینڈورفنز بھی خارج ہوتے ہیں۔ یہ کیمیکلز فوری جھٹکے کے بجائے ایک بتدریج خوشی پیدا کرتے ہیں جو جسمانی سکون اور ذہنی استحکام سے جڑی ہوتی ہے۔ اس عمل میں دماغ یہ سیکھتا ہے کہ خوشی کوشش کے بعد آتی ہے، اس لیے انتظار برداشت کے قابل بنتا ہے۔ یہی وہ نفسیاتی بنیاد ہے جس پر صبر جنم لیتا ہے۔

تخلیقی کام جیسے رنگ بھرنا، مٹی سے اشکال بنانا، لکڑی یا کاغذ سے کچھ تخلیق کرنا، یا لکھنا اور ڈرائنگ کرنا، دماغ کے اس حصے کو متحرک کرتے ہیں جو "Flow State" سے متعلق ہے۔ فلو اسٹیٹ میں انسان وقت کا احساس کھو دیتا ہے، اس کی توجہ بکھرتی نہیں بلکہ ایک نقطے پر مرکوز رہتی ہے۔ نفسیات میں یہ کیفیت انتہائی صحت مند سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس میں ڈوپامائن کی پیداوار بھی ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ کنٹرول اور تسلسل بھی سیکھا جاتا ہے۔ بچے جب کسی چیز کو آہستہ آہستہ بناتے ہیں تو انہیں فوری داد یا اسکرین کی چمک نہیں

ملتی، مگر اندرونی تسکین پیدا ہوتی ہے۔ یہ اندرونی تسکین ہی دراصل خود اعتمادی اور تحمل کی جڑ ہوتی ہے۔

سیکھنے کا عمل، خاص طور پر جب وہ زبردستی کے بجائے تجسس پر مبنی ہو، دماغ میں ایک نہایت متوازن ڈوپامائن ردعمل پیدا کرتا ہے۔ جب بچہ یا نوجوان کسی مسئلے کو حل کرتا ہے، کسی نئی بات کو سمجھنے میں وقت لگاتا ہے، اور آخرکار سمجھنے کے مقام پر پہنچتا ہے، تو دماغ اسے ایک "معنوی کامیابی" کے طور پر رجسٹر کرتا ہے۔ نفسیات کی زبان میں یہ Extrinsic Reward نہیں بلکہ Intrinsic Reward ہے، یعنی ایسی خوشی جو باہر سے نہیں بلکہ اندر سے جنم لیتی ہے۔ یہی اندرونی انعام انسان کو طویل المدت اہداف کے لیے تیار کرتا ہے اور فوری لذت کی طلب کو کم کرتا ہے۔

سماجی خدمت اور اجتماعی سرگرمیوں کا اثر محض اخلاقی نہیں بلکہ گہرے نفسیاتی محرکات پر مبنی ہوتا ہے۔ جب انسان کسی اور کے کام آتا ہے تو دماغ میں Oxytocin خارج ہوتا ہے، جو تعلق، اعتماد اور جذباتی سکون سے جڑا ہوا کیمیکل ہے۔ یہ کیمیکل انسان کو یہ احساس دیتا ہے کہ وہ کسی بڑے مقصد کا حصہ ہے۔ بچوں اور نوجوانوں میں یہ احساس بے حد اہم ہے، کیونکہ فوری ڈیجیٹل لذت انہیں تنہا کر دیتی ہے، جبکہ سماجی خدمت انہیں تعلق اور مقصد

عطا کرتی ہے۔ تعلق کا یہ احساس ذہنی بے چینی کو کم کرتا ہے اور صبر کو فطری بناتا ہے۔

کہانی سننا اور سنانا نفسیاتی طور پر Attention Span کی تربیت کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ جب بچہ ایک کہانی سنتا ہے جو ایک نشست میں مکمل نہیں ہوتی تو اس کا دماغ "Delayed Gratification" سیکھتا ہے، یعنی خوشی کو مؤخر کرنے کی صلاحیت۔ نفسیات میں یہ صلاحیت زندگی کی کامیابی سے براہ راست جڑی ہوئی سمجھی جاتی ہے۔ کہانی کا تسلسل بچے کے ذہن میں انتظار، یادداشت اور توقع کے نظام کو مضبوط کرتا ہے۔ یہی نظام بعد میں پڑھائی، عبادت اور تعلقات میں صبر کا سبب بنتا ہے۔

نوجوانوں کے معاملے میں متبادل معنویت دینا اس لیے ضروری ہے کہ اس عمر میں شناخت (Identity) کی تشکیل ہو رہی ہوتی ہے۔ اگر نوجوان کو صرف اسکرین کی فوری خوشی ملتی رہے تو اس کی شناخت صارف اور تماشائی بن کر رہ جاتی ہے۔ جب اسے کوئی ہنر، کوئی مقصد یا کوئی فکری جدوجہد دی جاتی ہے تو دماغ میں Dopamine کے ساتھ ساتھ Purpose-driven Motivation پیدا ہوتی ہے۔ یہ محرک وقتی نہیں بلکہ دیرپا ہوتا ہے۔ نفسیات میں اسے Self-Determination کہا جاتا ہے، یعنی انسان خود کو

کسی مقصد کے لیے متحرک محسوس کرتا ہے، نہ کہ کسی بیرونی محرک کے تحت۔

عبادت، خاص طور پر نماز میں خشوع یا تلاوتِ قرآن کے ساتھ تدبر، نفسیاتی اعتبار سے ذہنی نظم (Mental Regulation) کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ جب عبادت شعوری ہو تو دماغ کے وہ حصے فعال ہوتے ہیں جو خود پر کنٹرول، جذباتی توازن اور طویل توجہ سے متعلق ہیں۔ اس میں خوشی کا محرک فوری نہیں ہوتا بلکہ سکون، معنی اور قربت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبادت ڈوپامائن کی لت کا توڑ بنتی ہے، بشرطیکہ اسے دباؤ کے بجائے شعور کے ساتھ اپنایا جائے۔

بالغ افراد کا عملی نمونہ نفسیاتی طور پر "Model Learning" کہلاتا ہے۔ بچے محض ہدایات سے نہیں بلکہ مشاہدے سے سیکھتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ والدین خود اسکرین سے ہٹ کر وقت گزار سکتے ہیں، کسی کام میں صبر کے ساتھ لگے رہتے ہیں، یا اختلاف پر ضبط کا مظاہرہ کرتے ہیں، تو بچے کا دماغ اسی رویے کو نارمل اور قابلِ تقلید سمجھتا ہے۔ یوں صبر کوئی زبانی نصیحت نہیں بلکہ ایک زندہ تجربہ بن جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ڈوپامائن کا صحت مند متبادل کسی ایک سرگرمی کا نام نہیں بلکہ خوشی کے پورے تصور کی تربیت ہے۔ جب خوشی رفتار کے بجائے گہرائی سے، فوری جھٹکے کے بجائے تدریج سے، اور تنہائی کے بجائے معنی اور تعلق سے جڑ جائے تو دماغ خود بخود صبر، تحمل اور توجہ کو اپنا معمول بنا لیتا ہے۔ یہی نفسیاتی توازن انسان کو ڈیجیٹل دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کا غلام بننے سے بچاتا ہے۔

آخر میں یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ صبر اور تحمل کوئی پرانی یا فرسودہ اخلاقیات نہیں بلکہ آنے والے دور کی بقا کی صلاحیت ہیں۔ ایک ایسا انسان جو اپنی توجہ کو قابو میں رکھ سکتا ہو، جو فوری لذت کے بجائے دور رس مقصد کے لیے انتظار کر سکتا ہو، اور جو ذہنی شور میں بھی اندرونی سکون قائم رکھ سکے، وہی فکری، اخلاقی اور روحانی طور پر آزاد انسان ہو گا۔ ڈیجیٹل دنیا سے فرار ممکن نہیں، مگر اس کے ساتھ شعوری تعلق قائم کرنا ممکن ہے، اور یہی صبر کی جدید ترین شکل ہے۔

لفظوں کے جادو سے شخصیت کی تعمیر

انسانی تربیت کا ایک نہایت لطیف مگر مؤثر اصول یہ ہے کہ انسان کو اس کی موجودہ کمزوری کے آئینے میں نہیں بلکہ اس کی ممکنہ خوبی کے آئینے میں دیکھا جائے۔ جب ایک بچہ جھوٹ بولتا ہے اور کوئی بزرگ یا نیا ملنے والا اس کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ "نہیں، یہ جھوٹ نہیں بول سکتا، یہ تو بہت سچا بچہ ہے"، تو بظاہر یہ ایک سادہ جملہ محسوس ہوتا ہے، مگر نفسیات کی دنیا میں یہ ایک گہرا تربیتی عمل ہے۔ اسے جدید علمِ نفسیات میں عموماً Self-Fulfilling Prophecy اور Pygmalion Effect کے تناظر میں سمجھا جاتا ہے، یعنی وہ توقع جو انسان کے بارے میں قائم کی جائے، آہستہ آہستہ اس کی شخصیت کی تشکیل میں حصہ لینے لگتی ہے۔

Pygmalion Effect کی اصطلاح یونانی اساطیر کے کردار Pygmalion سے ماخوذ ہے، جس نے اپنے تراشے ہوئے مجسمے سے اس قدر محبت اور یقین کا تعلق قائم کیا کہ وہ مجسمہ گویا زندگی پا گیا۔ نفسیات میں اس مثال کو اس حقیقت کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ مثبت توقعات افراد کی کارکردگی اور کردار کو بہتر بنا سکتی ہیں۔ جب بچے کو یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ وہ سچا ہے، تو اس کے اندر ایک نئی شناخت جنم لیتی ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے

کہ اگر سب مجھے سچا سمجھتے ہیں تو مجھے ویسا ہی ہونا چاہیے۔ یوں بیرونی توقع اندرونی عزم میں بدلنے لگتی ہے۔

اسی مفہوم کو سماجیات میں Robert K. Merton نے Self-Fulfilling Prophecy کے عنوان سے بیان کیا۔ ان کے مطابق اگر کسی فرد کے بارے میں کوئی تصور قائم کر کے اس کے مطابق برتاؤ کیا جائے تو وہ تصور بالآخر حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے۔ بچے کے بارے میں مسلسل یہ کہنا کہ "یہ ایماندار ہے" دراصل اس کے ذہن میں ایک خودیاتی خاکہ بناتا ہے۔ انسان اپنی شناخت کے خلاف زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ اگر اسے اپنی پہچان "جھوٹا" ملے تو وہ لاشعوری طور پر اسی قالب میں ڈھل سکتا ہے، اور اگر اسے "سچا" کہا جائے تو وہ اس شناخت کی حفاظت کرنے کی کوشش کرے گا۔

یہی عمل Positive Labeling کہلاتا ہے، یعنی کسی فرد کو شعوری طور پر ایک مثبت لیبل دینا تاکہ وہ اس لیبل کے مطابق اپنے رویّے کو ترتیب دے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ منفی لیبلنگ بھی اسی شدت سے اثرانداز ہوتی ہے۔ اگر بچے کو بار بار "جھوٹا" کہا جائے تو وہ اپنے آپ کو ویسا ہی سمجھنے لگتا ہے اور اس کے لیے جھوٹ بولنا ایک معمولی عمل بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب اسے

سچائی سے منسوب کیا جائے تو وہ اپنے اندر ایک اخلاقی ذمہ داری محسوس کرتا ہے کہ اسے اس اعتماد کو ٹوٹنے نہیں دینا۔

رفتہ رفتہ یہ نفسیاتی حکمتِ عملی بچے کی خود آگاہی کا حصہ بن جاتی ہے۔ وہ محض سزا کے خوف سے سچ نہیں بولتا بلکہ اس لیے سچ بولتا ہے کہ اس کی خودی کا تقاضا یہی ہے۔ یوں تربیت بیرونی کنٹرول سے نکل کر اندرونی نظم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں اخلاقی عادت کردار میں ڈھل جاتی ہے۔

اسلامی تربیتی روایت میں بھی اس اصول کی گہری جھلک ملتی ہے۔ معصومینؑ کی سیرت میں بچوں کو عزت دینا، ان کی مثبت صفات کو نمایاں کرنا اور ان کے مستقبل کے بارے میں خیر کی توقع ظاہر کرنا عام تھا۔ یہ محض اخلاقی نرمی نہیں بلکہ ایک عمیق نفسیاتی بصیرت تھی۔ جب کسی انسان کو اس کے امکانِ خیر کے ساتھ جوڑا جاتا ہے تو وہ اپنے اندر اسی امکان کو حقیقت بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا تربیت کا اصل ہدف غلطی کو پکڑنا نہیں بلکہ شخصیت کے اندر خیر کے بیج کو پانی دینا ہے۔

البتہ اس اصول کے استعمال میں حکمت ضروری ہے۔ اگر مثبت لیبل حقیقت سے بالکل منقطع ہو اور بچہ اس تضاد کو شدت سے محسوس کرے تو اس کا الٹا اثر بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مثبت نسبت کے ساتھ تدریجی

اصلاح اور عملی رہنمائی بھی ہو۔ یعنی بچے کو سچا کہا جائے اور ساتھ ہی ایسے مواقع دیے جائیں جہاں وہ سچ بول کر اس شناخت کو مضبوط کر سکے۔

لہذا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان اپنے بارے میں جو کہانی سنتا ہے، آہستہ آہستہ وہی کہانی بننے لگتا ہے۔ اگر ہم بچوں کو ان کی خطاؤں کی کہانی سناتے رہیں گے تو وہ خطا کی داستان میں جکڑ جائیں گے، اور اگر ہم انہیں ان کے ممکنہ حسن کی داستان سنائیں گے تو وہ اس حسن کو حقیقت بنانے کی کوشش کریں گے۔ نفسیات کی زبان میں یہ Pygmalion Effect اور Self-Fulfilling Prophecy ہے، مگر تربیت کی زبان میں یہ امید، حسنِ ظن اور شخصیت سازی کا وہ لطیف ہنر ہے جو انسان کو اس کی موجودہ کمزوری سے اٹھا کر اس کے ممکنہ کمال تک لے جا سکتا ہے۔

اب اگر اسی اصول کو عملی مثالوں کے ذریعے سمجھا جائے تو بات مزید واضح ہو جاتی ہے،

فرض کریں ایک سات سالہ بچہ مہمانوں کے سامنے کوئی بات چھپا دیتا ہے یا سچ کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ والد فوراً ڈانٹنے کے بجائے مسکرا کر کہتے ہیں، "مجھے معلوم ہے میرا بیٹا سچ بولنے والا ہے، شاید ابھی گھبرا گیا ہو گا۔" یہ جملہ دو کام کرتا ہے۔ ایک طرف وہ بچے کی غلطی کو نرم انداز میں نمایاں کرتا ہے،

دوسری طرف اس کی بنیادی شناخت "سچا" ہونے کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ اگلی بار جب وہ کسی مشکل صورت حال میں ہو گا تو اس کے ذہن میں یہ آواز آئے گی کہ "میں تو سچا بچہ ہوں"، اور یہی اندرونی مکالمہ اسے سچ کی طرف دھکیل دے گا۔

اس کے برعکس اگر اسی لمحے کہا جائے، "تم ہمیشہ جھوٹ بولتے ہو، تم پر کبھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا"، تو بچہ دو راستوں میں سے ایک اختیار کرے گا۔ یا تو وہ خوف کی وجہ سے وقتی سچ بولے گا مگر اندر سے خود کو جھوٹا مان لے گا، یا پھر وہ سوچے گا کہ جب مجھے جھوٹا سمجھا ہی جاتا ہے تو جھوٹ بولنے میں کیا حرج ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مثبت لیبل اور منفی لیبل اپنی الگ الگ تقدیریں لکھتے ہیں۔

اسی اصول کو تعلیمی ماحول میں دیکھیں۔ ایک استاد کسی اوسط درجے کے طالب علم سے کہتا ہے، "مجھے معلوم ہے تم میں غیر معمولی صلاحیت ہے، تم بس تھوڑی توجہ دو تو سب سے آگے آ سکتے ہو۔" یہ جملہ محض حوصلہ افزائی نہیں بلکہ ایک شناخت کی پیشکش ہے۔ طالب علم اب خود کو کمزور نہیں بلکہ "صلاحیت رکھنے والا" سمجھنے لگتا ہے۔ نتیجتاً وہ اپنی کارکردگی بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جسے نفسیات میں Pygmalion کے نام

سے منسوب اثر یعنی Pygmalion Effect کہا جاتا ہے، جہاں توقع کارکردگی کو بدل دیتی ہے۔

اسی طرح دفاتر میں بھی یہی اصول کام کرتا ہے۔ ایک منیجر اگر کسی ملازم کے بارے میں یہ رائے قائم کرلے کہ "یہ ذمہ دار انسان ہے"، تو وہ اسے اہم ذمہ داریاں سونپتا ہے، اس پر اعتماد ظاہر کرتا ہے، اور لاشعوری طور پر اس سے سنجیدہ رویّے کی توقع رکھتا ہے۔ ملازم بھی خود کو اسی معیار پر پورا اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر شروع ہی سے اسے "لاپرواہ" سمجھ لیا جائے تو نگرانی سخت ہو جاتی ہے، اعتماد کم ہو جاتا ہے، اور بالآخر وہ واقعی غیر ذمہ دار دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے Robert K. Merton نے Self-Fulfilling Prophecy کہا تھا، یعنی وہ تصور جو حقیقت میں بدل جائے۔

ازدواجی زندگی میں بھی یہ اصول حیرت انگیز طور پر مؤثر ہے۔ اگر بیوی کو بار بار یہ کہا جائے کہ "تم بہت سمجھدار ہو، تمہاری رائے متوازن ہوتی ہے"، تو وہ اپنے فیصلوں میں سنجیدگی اور توازن بڑھانے کی کوشش کرے گی کیونکہ اس کی شناخت اسی وصف سے جڑ چکی ہے۔ اگر شوہر کو کہا جائے، "تم ذمہ دار انسان ہو، گھر تمہارے فیصلوں سے سنبھلا ہوا ہے"، تو وہ اس اعتماد کو برقرار

رکھنے کے لیے مزید ذمہ داری کا مظاہرہ کرے گا۔ لیکن اگر مسلسل یہ کہا جائے کہ "تم سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہوتا"، تو رفتہ رفتہ انسان کی عملی توانائی بھی ماند پڑنے لگتی ہے۔

روحانی اور اخلاقی میدان میں بھی یہی اصول کار فرما ہے۔ اگر کسی نوجوان کو بار بار یہ کہا جائے کہ "تم پاکیزہ فطرت رکھتے ہو، تم گناہ کے لیے نہیں بنے"، تو وہ اپنے نفس کے مقابلے میں ایک اعلیٰ شناخت کو یاد رکھے گا۔ لیکن اگر اسے یہ باور کرایا جائے کہ "آج کل کے نوجوان تو ایسے ہی ہوتے ہیں"، تو وہ اسی عمومی تصور میں خود کو گم کر سکتا ہے۔

یہ تمام مثالیں اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہیں کہ انسان اپنے بارے میں سنائی جانے والی کہانی کو اندر جذب کر لیتا ہے۔ بچہ ہو یا بڑا، شاگرد ہو یا استاد، ملازم ہو یا سربراہ، سب کی نفسیاتی ساخت میں یہ اصول مشترک ہے کہ شناخت رویّے کو جنم دیتی ہے۔ جب ہم کسی کو اس کی ممکنہ خوبی سے منسوب کرتے ہیں تو ہم اس کے اندر ایک اخلاقی ذمہ داری جگاتے ہیں۔ وہ صرف دوسروں کو خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی خودی کے تحفظ کے لیے بہتر بننے کی کوشش کرتا ہے۔

یوں تربیت کا راز یہ نہیں کہ ہم ہر غلطی کو سختی سے پکڑیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم انسان کو اس کے ممکنہ حسن کی یاد دہانی کراتے رہیں۔ جب شناخت بلند ہو جائے تو رویّہ خود بخود اس کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لفظ کردار کو تراشتے ہیں اور نسبت تقدیر کو بدل دیتی ہے۔

جملوں کے منفی اثر سے خودی کی حفاظت

مثبت توقع، مثبت لیبلنگ اور خود پوری ہونے والی پیش گوئی جیسی نفسیاتی حکمتیں جہاں تعمیرِ شخصیت کا ذریعہ بنتی ہیں، وہیں اگر غلط ہاتھوں میں چلی جائیں تو نہایت باریک انداز میں استحصال کا ذریعہ بھی بن سکتی ہیں۔ کیونکہ ان کا اصل میدان انسان کی شناخت ہے، اور جب شناخت کو چھیڑا جائے تو انسان کے فیصلے، احساسات اور وفاداریاں سب متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان اصولوں کو سمجھنا ہی نہیں بلکہ ان کے منفی استعمال سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے۔

منفی استعمال کی پہلی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی فرد کو جان بوجھ کر ایک ایسا لیبل دیا جائے جو اسے کسی خاص مفاد کے لیے استعمال کرنے میں مدد دے۔ مثال کے طور پر کسی نوجوان سے کہا جائے کہ "تم تو بہت بہادر ہو، تم ہی اصل وفادار ہو، تم وہ کام کر سکتے ہو جو عام لوگ نہیں کر سکتے"، اور پھر اس تعریف کو استعمال کر کے اسے خطرناک، غیر اخلاقی یا غیر قانونی سرگرمیوں میں دھکیل دیا جائے۔ یہاں تعریف دراصل تعریف نہیں بلکہ شناخت کے ذریعے

کنٹرول کا آلہ ہے۔ انسان اپنے بارے میں قائم کی گئی تصویر کو بچانے کے لیے ایسے فیصلے بھی کرلیتا ہے جو وہ آزاد ذہن کے ساتھ شاید کبھی نہ کرتا۔

اسی طرح بعض مذہبی، سیاسی یا سماجی گروہ اپنے ماننے والوں کو یہ لیبل دیتے ہیں کہ "تم منتخب لوگ ہو، تم باقیوں سے برتر ہو، تم سچ کے واحد نمائندے ہو"۔ ابتدا میں یہ جملے حوصلہ افزائی محسوس ہوتے ہیں، مگر رفتہ رفتہ وہ ایک بند شناخت میں تبدیل ہو جاتے ہیں جہاں سوال کرنا غداری سمجھا جاتا ہے۔ یہاں Self-Fulfilling Prophecy ایک خطرناک رخ اختیار کر لیتی ہے۔ فرد کو اس طرح تشکیل دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی عقل کو معطل کر دے اور گروہی توقعات کے مطابق سوچنے لگے۔ اس مرحلے پر شناخت آزادی کو نگل لیتی ہے۔

دفاتر اور کاروباری ماحول میں بھی یہ استحصال دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی ملازم سے بار بار کہا جائے کہ "تم تو کمپنی کے سب سے وفادار اور مخلص انسان ہو"، اور اسی تعریف کی بنیاد پر اس سے غیر متوازن اوقاتِ کار، اضافی ذمہ داریاں یا غیر منصفانہ بوجھ لیا جائے۔ وہ شخص اس لیے انکار نہیں کر پاتا کہ اس کی خودی "وفادار" ہونے کے تصور سے بندھی ہوئی ہے۔ یوں تعریف ایک نفسیاتی دباؤ میں بدل جاتی ہے۔

ازدواجی یا ذاتی تعلقات میں بھی یہی حربہ استعمال ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص اپنے شریکِ حیات سے کہے کہ "تم تو بہت برداشت کرنے والی ہو، تم کبھی شکایت نہیں کرتیں"، اور پھر اسی نسبت کے ذریعے اس کی جائز شکایات کو خاموش کروا دے۔ یہاں مثبت لیبل دراصل جذباتی کنٹرول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ انسان اس لیے خاموش رہتا ہے کہ وہ اپنی دی گئی شناخت کے خلاف نہیں جانا چاہتا۔

ایسے منفی استعمال سے بچاؤ کا پہلا اصول یہ ہے کہ انسان اپنی شناخت کو دوسروں کے الفاظ پر مکمل طور پر منحصر نہ کرے۔ تعریف سننا فطری طور پر خوش کن ہے، مگر ہر تعریف کو حقیقت کا درجہ دینا خطرناک ہو سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ فرد اپنے اندر ایک تنقیدی شعور پیدا کرے اور خود سے سوال کرے کہ کیا یہ نسبت میرے اخلاقی اصولوں اور عقل کے مطابق ہے یا محض مجھے کسی سمت دھکیلنے کا ذریعہ ہے۔

دوسرا تحفظ یہ ہے کہ شناخت کو کسی ایک لیبل میں قید نہ ہونے دیا جائے۔ اگر کوئی ہمیں "بہادر" کہتا ہے تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ بہادری کا مطلب اندھی اطاعت نہیں بلکہ حق و باطل میں فرق کرنے کی جرات ہے۔ اگر کوئی ہمیں "وفادار" کہتا ہے تو وفاداری کا اصل مفہوم انصاف اور اصولوں کے ساتھ ہونا

چاہیے، نہ کہ ہر مطالبے کے سامنے سر جھکا دینا۔ یعنی ہمیں دی گئی نسبت کو اپنے اصولوں کے تابع رکھنا چاہیے، نہ کہ اصولوں کو نسبت کے تابع۔

تیسرا پہلو اجتماعی سطح پر ہے۔ گھر، مدرسہ، ادارہ یا معاشرہ ایسا ماحول پیدا کرے جہاں سوال کرنے، اختلاف رکھنے اور وضاحت مانگنے کی گنجائش ہو۔ جب ماحول میں مکالمہ زندہ ہو تو شناخت کو بطور ہتھیار استعمال کرنا آسان نہیں رہتا۔ استحصال ہمیشہ وہاں پھلتا ہے جہاں خاموشی، خوف یا اندھی وابستگی ہو۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان اپنی اصل قدر اور شناخت کو کسی انسان کے ہاتھ میں مکمل طور پر نہ دے بلکہ اسے اپنے بنیادی اخلاقی اور روحانی اصولوں سے جوڑے۔ جب انسان کا معیارِ خودی سچائی، عدل اور تقویٰ جیسے مستقل اصولوں سے وابستہ ہو تو کوئی بھی شخص اسے محض تعریف یا لیبل کے ذریعے غلط سمت میں زیادہ دیر تک نہیں لے جا سکتا۔ اس صورت میں وہ ہر تعریف کو ایک ذمہ داری سمجھے گا، مگر اس ذمہ داری کو اصولوں کے دائرے میں رکھے گا۔

یوں مثبت نفسیاتی اصول بذاتِ خود نہ اچھے ہیں نہ برے، ان کی اخلاقی جہت استعمال کرنے والے کی نیت اور شعور پر منحصر ہے۔ تعمیر اور تخریب دونوں کا امکان موجود ہے۔ اصل حفاظت اس بات میں ہے کہ انسان اپنی خودی کو

بیدار رکھے، اپنی شناخت کو اصولی بنیادوں پر استوار کرے، اور ہر نسبت کو عقل و ضمیر کی کسوٹی پر پرکھتا رہے۔ جب شعور زندہ ہو تو تعریف غلام نہیں بناتی بلکہ انسان کو مزید باوقار اور ذمہ دار بنا دیتی ہے۔

منفی لیبلنگ دراصل لفظوں کے ذریعے شناخت پر حملہ ہے۔ جب کسی انسان سے کہا جاتا ہے کہ "تم نہیں کر سکتے"، "تم تو ناکام ہو"، "تم غلام ذہن کے ہو"، یا "تم منحوس ہو"، تو یہ محض ایک جملہ نہیں ہوتا بلکہ ایک نفسیاتی بیج ہوتا ہے جو اگر اندر اتر جائے تو شخصیت کی جڑوں کو متاثر کرنے لگتا ہے۔ مثبت لیبل انسان کو اوپر اٹھا سکتا ہے تو منفی لیبل اسے اندر سے کھوکھلا بھی کر سکتا ہے۔ اس لیے اصل سوال یہ نہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم ان الفاظ کو اپنے اندر کہاں تک داخل ہونے دیتے ہیں۔

منفی لیبلنگ کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی صلاحیت کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ بچپن میں اگر کسی بچے سے بار بار کہا جائے کہ "تم سست ہو" تو وہ سستی کو اپنی فطرت سمجھنے لگتا ہے۔ اگر طالب علم سے کہا جائے کہ "تم ریاضی میں کبھی اچھے نہیں ہو سکتے" تو وہ کوشش کرنے سے پہلے ہی ہار مان لیتا ہے۔ یہی عمل رفتہ رفتہ "learned helplessness" میں بدل جاتا ہے، یعنی

سیکھ لی گئی بے بسی۔ انسان سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی تقدیر طے ہو چکی ہے اور کوشش بے معنی ہے۔

اسی طرح سماجی اور سیاسی میدان میں منفی لیبلنگ کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی قوم کو مسلسل یہ باور کرایا جائے کہ "تم پسماندہ ہو، تم قیادت کے قابل نہیں"، تو ایک اجتماعی احساسِ کمتری جنم لیتا ہے۔ کسی طبقے کو یہ کہا جائے کہ "تم تو اسی درجے کے لیے پیدا ہوئے ہو"، تو وہ طبقہ اپنے امکانات کو محدود سمجھنے لگتا ہے۔ یوں لیبل صرف فرد کو نہیں بلکہ پورے معاشرے کو قید کر سکتا ہے۔

خاندانی اور ازدواجی تعلقات میں بھی منفی نسبتیں شخصیت کو زخمی کرتی ہیں۔ اگر شریکِ حیات کو بار بار کہا جائے کہ "تم سے کچھ ٹھیک نہیں ہوتا"، تو وہ آہستہ آہستہ فیصلہ کرنے کی صلاحیت کھونے لگتا ہے۔ اگر کسی نوجوان کو یہ کہا جائے کہ "تم بگڑے ہوئے ہو"، تو وہ سوچ سکتا ہے کہ جب میری شناخت ہی یہی ہے تو پھر بہتری کی کوشش کیوں کروں۔ یہاں لیبل کردار کو نہیں بلکہ کردار کے امکان کو مار دیتا ہے۔

ایسے حالات میں تحفظ کا پہلا اصول یہ ہے کہ انسان اپنی شناخت کو بیرونی آوازوں سے الگ کرنا سیکھے۔ ہر جملہ حقیقت نہیں ہوتا۔ لوگ اکثر اپنے

خوف، غصے، تعصب یا کم علمی کی بنیاد پر لیبل دیتے ہیں۔ اگر کوئی کہتا ہے "تم نہیں کر سکتے"، تو یہ اس کی رائے ہے، کوئی آسمانی حکم نہیں۔ جب انسان اس فرق کو سمجھ لیتا ہے تو الفاظ کا زہر کم اثر کرنے لگتا ہے۔

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ایک متوازن خود مکالمہ پیدا کرے۔ اگر باہر سے منفی آواز آئے تو اندر سے ایک مثبت اور حقیقت پسند آواز موجود ہو جو کہے کہ "شاید میں ابھی مکمل نہیں، مگر میں سیکھ سکتا ہوں۔" یہ خود کلامی آہستہ آہستہ ذہنی ڈھال بن جاتی ہے۔ بیرونی لیبل اندرونی یقین کے بغیر دیرپا اثر نہیں ڈال سکتے۔

تیسرا پہلو عملی تجربہ ہے۔ منفی لیبل کو توڑنے کا سب سے مؤثر طریقہ چھوٹے چھوٹے عملی ثبوت پیدا کرنا ہے۔ اگر کسی کو کہا جائے کہ "تم قیادت نہیں کر سکتے"، تو وہ کسی چھوٹے گروہ میں ذمہ داری لے کر یہ ثابت کر سکتا ہے کہ وہ سیکھ رہا ہے۔ اگر کسی طالب علم کو "کمزور" کہا جائے تو وہ تدریجی محنت کے ذریعے اپنی کارکردگی بہتر بنا سکتا ہے۔ عملی کامیابیاں اندرونی بیانیے کو بدل دیتی ہیں اور پرانے لیبل کمزور پڑ جاتے ہیں۔

چوتھا پہلو ماحول کا انتخاب ہے۔ اگر انسان مسلسل ایسے لوگوں کے درمیان رہے جو اسے نیچا دکھاتے ہوں تو اس کا ذہنی استحکام متاثر ہو گا۔ ضروری ہے کہ

انسان ایسے حلقوں کا انتخاب کرے جہاں اصلاح ہو مگر تحقیر نہ ہو، جہاں تنقید ہو مگر تذلیل نہ ہو۔ صحت مند ماحول منفی لیبل کے اثر کو کم کر دیتا ہے۔

سب سے گہرا تحفظ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنی بنیادی قدر کو کسی عارضی صفت سے وابستہ نہ کرے۔ اگر انسان اپنی قدر کو محض کارکردگی، رائے یا دوسروں کی تعریف پر کھڑا کرے گا تو ہر منفی جملہ اسے ہلا دے گا۔ لیکن اگر وہ اپنی قدر کو اصولوں، اخلاقی معیار اور اپنی انسانی عظمت سے جوڑے گا تو عارضی الفاظ اس کی جڑ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہ سمجھ جائے گا کہ میں غلطی کر سکتا ہوں مگر میں خود غلطی نہیں ہوں؛ میں ناکام ہو سکتا ہوں مگر میں ناکامی نہیں ہوں۔

یوں منفی لیبلنگ سے حفاظت کا راز یہ ہے کہ انسان اپنی شناخت کا مرکز خود منتخب کرے۔ دوسروں کے الفاظ کو سننا ضروری ہے مگر انہیں اپنی تقدیر نہ بننے دینا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ جب شعور بیدار ہو، خود آگاہی مضبوط ہو اور انسان اپنے امکانِ کمال پر یقین رکھتا ہو، تو منفی لیبل محض آواز بن کر رہ جاتے ہیں، تقدیر نہیں بنتے۔